بچوں کا ماہنامہ اُمنگ
اگست ۲۰۲۱ء
جشن آزادی نمبر
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
ہمارا ہمارا
دہلی
منا رہی ہے
جشنِ آزادی@75
اردو اکادمی دہلی

مبارک
ہو
جشنِ یومِ آزادی
تصویر: نِکولٹ
Free under
Unsplash license

وائس چیئرمین: حاجی تاج محمد

مدیر: محمد اے عابد، سکریٹری

جلد نمبر: ۳۶، شمارہ نمبر: ۸، اگست ۲۰۲۱ء

فی شمارہ آٹھ روپے، سالانہ اسّی روپے

ڈرافٹ/چیک سکریٹری اردو اکادمی، دہلی کے نام ہونا چاہیے

خط و کتابت کا پتہ:

اُردو اکادمی، دہلی

سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔110006

Email: aiwaneurduumangdelhi@gmail.com

فون نمبر:

23865436, 23863856
22863566, 23863697

سرورق: شیراز حسین عثمانی، واصف جمال

ISSN: 2321-287X

محمد اے عابد، سکریٹری اردو اکادمی، دہلی (پرنٹر، پبلشر) نے ایس ڈی ایم پرنٹر اینڈ پیکر، بی۔۲۱۵، سیکٹر۔۴، بوانا انڈسٹریل ایریا، دہلی۔۱۱۰۰۳۹ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، دہلی سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، نزد رٹز سنیما، کشمیری گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶ سے جاری کیا۔

پیارے بچو!

اس سال ہم پچھتر واں جشن آزادی منا رہے ہیں۔ آزادی پانے کے لیے ہمارے بڑوں نے بہت بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ نہ اپنے مال و دولت کو اہم سمجھا اور نہ اپنی جان کو۔ ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آزادی کی اس جنگ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس وقت تک کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑتے رہے ہیں جب تک ملک آزاد نہیں ہو گیا۔ ہر قوم کے لوگوں نے انگریز حکمرانوں کے مظالم برداشت کیے، لیکن زبان سے اُف تک نہیں کی۔ شہید اشفاق اللہ خاں، شہید بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد وغیرہ کی قربانیوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی جوہر، مولوی برکت اللہ بھوپالی، مولانا ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، بی اماں، پنڈت موتی لعل نہرو، پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد، سردار پٹیل وغیرہ نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر ان کے عظیم منتر ''اہنسا'' پر عمل کیا اور اپنی ناقابل فراموش خدمات سے یہ ثابت کر دیا کہ ہم ملک آزاد کرا کر رہیں گے اور ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔

گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون اور ''ستیہ گرہ'' کے ذریعہ اس وقت تک اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی جب تک ملک آزاد نہیں ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں تمام مجاہدینِ آزادی اس وقت تک انگریزی حکومت کے خلاف سرگرم رہے جب تک ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد نہیں ہو گیا۔

آج ہم اور آپ جو آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں یہ سب ہمارے مجاہدین آزادی کی محنتوں کا پھل ہے۔

بچوں کا ماہنامہ اُمنگ کے اس شمارے میں آزادی پر مضامین اور نظمیں شامل اشاعت کی گئی ہیں۔ یہ ان مجاہدین آزادی کو ایک سچا خراجِ عقیدت ہے۔

آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا، ضرور لکھیے۔ ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار ہے۔

ادارہ

حقیقی آزادی

محمد قمر سلیم......

تڑپ تڑپ کے گزارے ہیں کتنے شام و سحر
بھٹک بھٹک کے اندھیروں میں کی ہے عمر بسر
ابھر ابھر کے ہزار آفتاب ڈوبے ہیں
یہ صبح خاص ہوئی ہے نصیب تب جا کر

اس سال ہم آزادی کی ۷۵ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ سال کی طویل جنگ، انتھک کوششوں، دن رات کی جدّ و جہد کے بعد ۱۵راگست ۱۹۴۷ کو ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ افق پر آفتاب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ابھرتے ابھرتے اس نے ہمیں ایک نئی صبح کا پیغام دیا اور وہ پیغام تھا آزادی کا۔ ہم سرشار تھے، ہم آزاد تھے، ہمارے چہرے منور تھے اور ہم مدہوش تھے لیکن ڈوبتے ڈوبتے وہ ایک کسک، ایک خلش بھی چھوڑ گیا۔ ایک وسیع ملک کے تقسیم ہونے کی۔ بھائی بھائی سے جدا ہو گیا۔ بیٹا ماں سے جدا ہوا۔ بیوی شوہر سے جدا ہوئی، سایہ جسم سے جدا ہو گیا۔ کیا ہے دستورِ دنیا ایک ہاتھ سے زخم لگاتی ہے تو دوسرے سے مرہم بھی رکھتی ہے۔

ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ زندگی اور موت، دن اور رات، صبح و شام، پھول اور کانٹے، اجالے اور اندھیرے، سچ اور جھوٹ، خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وقت کبھی نہیں ٹھہرا ہے۔ وقت نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ غم بھی اللہ دیتا ہے اور صبر بھی وہی دیتا ہے۔ آہستہ ہستہ ہمارے زخم بھرنے لگے اور ہندوستان ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے بے پناہ ترقی کی۔ اس ترقی میں ہر ہندوستانی کے خون پسینے کی بو آتی ہے۔ ہم ہندوستانیوں نے مانگے کے اجالوں سے اپنے گھروں کو روشن نہیں کیا بلکہ ہمارے گھروں میں ہمارے سورج کا ہی اجالا ہے۔ آج ہمیں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔

ہم مختلف مذاہب و مختلف عقائد کو ماننے والے، مختلف رنگ و بو میں جینے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف صوبوں میں رہنے والے اور ہماری تہذیب مختلف رنگوں سے سجی ہوئی ضرور ہے لیکن ہمارے خون کا رنگ تو سرخ ہی ہے کیوں کہ جب یہ ٹپکتا ہے تو کوئی بھی پہچان نہیں سکے گا کہ یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، گجراتی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، شیخ و برہمن، شیعہ و سنّی، چھتری و شودر، امیر و غریب کا خون ہے۔ ہم ہندوستانی ایک چمن کے رنگ برنگے پھول ہیں۔ ایک ہی مالا کے موتی ہیں۔ آسمان پر بکھرے ہوئے لاتعداد تاروں کا جھومر ہیں۔

اپنے اس خوبصورت سرمائے کو بچا کر رکھنے کے لیے ہمیں ضرورت ہے کھلے ذہن، روشن ضمیر کی۔ کیوں کہ ہماری آزادی ہمارا ایک عظیم اثاثہ ہے۔ وہ آزادی جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ کیا ہی خوب منظر تھے وہ جب جنونی آزادی کے متوالے آزادی کے لیے اپنی جانوں کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وقت وہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان، نہ سکھ نہ عیسائی۔ کیسے بھولیں گے ہم بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں جیسے جیالوں کو۔

لوگ کہتے ہیں کہ مذہب ہم میں نفرت پیدا کرتا ہے، مذہب ہمیں الگ الگ خانوں میں بانٹتا ہے، مذہب کی بنا پر ہم شدت اختیار کرتے ہیں لیکن لوگوں کو علامہ اقبال کا یہ شعر بھی یاد رکھنا چاہیے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

دراصل مذہب اچھے عمل پر زور دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اعمال کے لیے ہم خود ذمے دار ہوں گے۔ مذہب دوسروں پر جبر اور زیادتی کا حکم نہیں دیتا ہے۔ کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جو دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہو۔ مذہب تو محبت اور اخوت کا پیغام دیتا ہے۔ بھائی چارہ سکھاتا ہے۔ میل ملاپ بڑھاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ مذہب کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ مذہب تو بلاتفریق ایک صف میں کھڑے ہونے کا نام ہے!

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سچی آزادی کا راز تو تعلیم میں پوشیدہ ہے اور یہ کام آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ آؤ بچو! آج ہم عہد کریں کہ ہم علم کی شمع روشن کریں گے اور اندھیروں کو مٹا کر اپنے ضمیر کو روشن کریں گے۔ یہی حقیقی آزادی کی سوغات ہوگی۔

Aatma Shanti Co-operative Housing Society,
Plot No.33, Sec-3, Washi, Navi Mumbai-400703
M-9322645061

یومِ آزادی اسلام کے آئینے میں

رونق جمال......

پندرہ اگست ۱۹۴۷کوہمیں انگریزوں کی غلامی سے ڈھائی سوسال کی غلامی کے بعد آزادی ملی تو وہ دن وہ تاریخ وہ سال ہمارے لیے ہی نہیں ساری دنیا کے لیے اہم ہوگیا۔ کیونکہ دنیا کے جس بھی ملک میں ہندوستانی آباد ہیں ہر سال پندرہ اگست کو آزادی کا جشن مناتے ہیں۔ ہندوستان میں یومِ آزادی قومی تہوار کی شکل میں خاص و عام دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ خاص کر پندرہ اگست کو طلبا و طالبات کا جوش وخروش قابلِ دید ہوتا ہے۔ چمچماتے لباس آزادی کی خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے، تھرکتے ہوئے پیر بےلوث خوشی جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تینوں افواج اور پولیس کی خوبصورت پریڈ وترنگے کو سلامی کا جذبہ ترنگے کا احترام دیکھتے نہیں بنتا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ڈاکٹر علامہ اقبال کا ترانہ جن گن من ٹیگور کا راشٹریہ گیت آزادی کے جشن میں روح کا کام کرتا ہے۔ چاروں طرف دیش بھکتی کے گیت سارا دن ملک کے کونے کونے میں ایک انوکھا ماحول انوکھا جوش اور ایک انوکھا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔

لیکن کیا آپ جانتے ہیں پندرہ اگست ۱۹۴۷یعنی یومِ آزادی کا اسلامی کیلنڈر سے کیا تعلق ہے؟ نہیں نا تو آؤ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ۱۹۴۷میں پندرہ اگست کے دن جب ہم کو آزادی ملی تھی اسلامی کیلنڈر کے حساب سے ۱۳۶۶ ہجری تھی۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ دن جمعہ کا تھا، ستائیس تاریخ تھی یعنی اُسی دن شبِ قدر تھی۔ دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ملک کی آزادی کو کیسے اسلام کے سب سے افضل مہینے رمضان شریف سے اسلام کی سب سے افضل رات شبِ قدر سے اور اسلام کے سب سے افضل دن جمعہ سے جوڑ دیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے آپ نے آزادی کی فضا میں سانس لی ہے جو ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم سب دعا کرتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان قیامت تک آزاد رہے، خوش حال رہے اور دنیا میں سب سے نمایاں ہوجائے اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے۔ آمین ثم آمین۔!!!

"Kainat" Street No. 9, New Aadarsh Nagar,
Durg-491001, Chattisgarh
Mobile: 9981072672

۱۸۵۷ء کی
جنگ آزادی کی خاتون مجاهد
بیگم حضرت محل

.......ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

۱۸۵۷ء ہماری جنگ آزادی کا ایک اہم اور انتہائی جرأت مندانہ قدم ہے۔اسے محبّ وطن اور جانباز سپاہیوں اور لوگوں کی جدو جہد اور قربانیوں کا ثمرہ کہنا چاہئے۔ان لوگوں نے پہلی جنگ آزادی کا آغاز کیا۔آزادی کے متوالوں نے ان کے نقش قدم پر چل کر آزادی حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی تاریخ میں مرد مجاہدین آزادی کے ساتھ خواتین مجاہدین آزادی کے اسمائے گرامی اور ان کے کارنامے درج ہیں۔سرفہرست میں عزیزن، سبز پوش خاتون، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، جھلکاری بائی اور مینا بائی کے ناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ۵/دسمبر ۱۸۵۴ء کو اودھ کا ریذیڈنٹ کا چارج کرنل اوٹرم کو ملا اوٹرم کی رپورٹ اور ڈلہوزی کی پالیسی مسئلہ الحاق اور امدادی فوج کے مطابق ۲۱/نومبر ۱۸۵۵ء کو اودھ کا الحاق کیا۔ ۴/فروری ۱۸۵۶ء کو بادشاہ کی سلطنت ضبط ہوئی۔ واجد علی شاہ کو ۱۵/جون ۱۸۵۷ء کو فورٹ ولیم کالج میں نظر بند کر دیا گیا۔

واجد علی شاہ کی تقریباً تین درجن بیگمات کا ذکر ہوتا ہے۔ان میں بیگم حضرت محل بھی تھیں جو بادشاہ کے ساتھ نہیں گئیں۔بیگم حضرت محل کا خیال تھا کہ بادشاہ کو نہ لندن جانا چاہئے نہ کلکتہ منتقل ہونا چاہئے بلکہ لکھنؤ میں رہ کر اپنی ریاست اور عوام کے آس پاس کے جاگیردار، راجہ اور مہا راجاؤں کو متحد کر کے انگریزوں سے مقابلہ کرنا چاہئے لڑکر نہ صرف اپنی حکومت بلکہ پورے ہندوستان کو انگریزوں کے مظالم سے آزاد کرانا چاہئے، لیکن بادشاہ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔یہ کام بیگم حضرت محل نے لکھنؤ میں رہ کر انجام دیا اور انگریزوں سے جنگ کی اور اپنے بیٹے برجیس قدر کو فوجی کمیٹی کے اصرار پر اودھ کا بادشاہ بنایا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، مقابلہ کیا لیکن ان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔(بیگم حضرت محل، وسیم احمد سعید۔ص:۴۷)

بیگم حضرت محل کا ایک خطاب مہک پری بھی تھا۔بیگم نے محبت اور اتحاد کی خوشبو بکھیر کر متحد کیا۔انگریزوں کے خلاف راجاؤں، زمینداروں اور لوگوں سے مل کر ایک بڑا محاذ قائم کیا۔جن میں ہندو مسلم سب شریک تھے۔ان میں خصوصاً بیسواڑہ کے رانا بینی مادھو بخش، مہونا کے راجہ درگ بیجا سنگھ، شاہجہاں پور کے خان علی خان، فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ، راجہ مان سنگھ اور راجہ جے لال سنگھ کی شمولیت تھی۔دہلی اور کانپور کی شکست کے بعد نانا صاحب پیشوا بھی لکھنؤ آ گئے تھے اور حضرت محل کے مہمان تھے۔دہلی کے محاذ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد جنرل بخت خان اور شہزادہ فیروز شاہ بھی یہاں آن پہنچے۔بیگم حضرت محل کی عزیمت نے مارچ ۱۸۵۸ء تک لکھنؤ کے محاذ پر مستحکم قبضہ قائم رکھا۔اسی دوران ملکہ کا ایک معتمد خاص راجہ بال کرشن انگریزوں سے جاملا اور تعلقہ داروں کو اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے اور کمپنی بہادر کی خیر خواہی کا دم بھرنے پر آمادہ کیا۔اس سے آزاد لشکر میں کمزوری پیدا ہونے لگی۔غداریاں رنگ لائیں، راجہ نیپال کی کمک پہنچی۔چولکھی پر بھاری جنگ ہوئی۔محمد خان نے ملکہ سے اصرار پر کہا کوٹھی چھوڑ کر چلی جائیں۔آخر ملکہ نے ۱۶/مارچ ۱۸۵۸ء کو کوٹھی چھوڑ کر لکھنؤ سے رخصت ہونے کا قصد کیا۔(نامور مغل شہزادیاں، طلحہ علی، ص:۱۹۹-۱۹۸)

بیگم نے انگریزی حکمرانوں کا جولائی ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۵۸ء تک تقریباً ۹ مہینے مقابلہ کیا۔اس لڑائی میں (۲۵ فروری ۱۸۵۸ء) دوسرے افسروں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر خود شامل ہوئیں۔بیلی گارد میں کامیابی حاصل کی اور اس لڑائی میں کمشنر لارنس اور ہڈسن اور جنرل نیل کام آئے۔یہ وہی میجر ہڈسن ہے جس نے بادشاہ ظفر کے دولڑکوں اور ایک پوتے کا سر قلم کیا تھا۔آخری چولکھی کی لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس موقع پر نیپالی گورکھا فوج سکھوں اور جاٹوں کی کمک کی آمد سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ساتھ ہی قنوجی لال نے غداری کی۔کمانڈر کیمبل کو ہندوستانی کے

بھیس میں انگریزی کیمپ لایا۔ انگریزی توپوں اور بندوقوں کے سامنے تلواریں نہ چلیں۔ ۱۶/ مارچ ۱۸۵۸ء کو ملکہ نے کوٹھی چھوڑ کر لکھنؤ سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔ احمد اللہ شاہ نے بھی ملکہ کو انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کے نتائج سے آگاہ کیا اور لڑائی جاری رکھتے ہوئے رخصتی کا موقع پیدا کیا۔ اسی دوران جنرل اوٹرم نے صلح نامہ پر دستخط کرنے کا پیغام پہنچایا۔ سرکار انگریزی سے معافی مانگ لیں۔ آپ کا ملک واپس دینے اور تمام اعزاز و اکرام لوٹانے کو تیار ہیں۔ بیگم حضرت محل نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ نیپال میں صرف بیس افراد کو پناہ کی اجازت ملی۔ اپریل ۱۸۷۹ء بقول امبریش کشور نیپال ہی میں انتقال ہوا۔ تاریخ وفات میں بھی کافی اختلافات ہیں۔ وسیم احمد سعید ۷/ اپریل ۱۸۷۹ء لکھتے ہیں، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے اپنی تصنیف میں ۱۸۷۴ء لکھا ہے)۔

بیگم حضرت محل کا نام امراؤ بیگم تھا۔ لکھنؤ اکبری دروازہ کے قریب چودھرائن امام باڑہ میں ان کا قیام تھا۔ اسی زمانہ میں خواصوں نے واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے پسند کر کے متعہ کیا اور مہک پری خطاب دے کر رقص کی تعلیم میں لگایا۔ جب مہک پری حاملہ ہوئیں تو ان کو پردے میں بٹھا کر افتخار النساء خانم صاحبہ خطاب عنایت فرمایا۔ ان سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام رمضان علی رکھا۔ دادا نے مرزا برجیس قدر بہادر، نام سے نوازا۔ ۱۲/ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ بنے تو بیگم حضرت محل کا خطاب دیا گیا۔

۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا اور واجد علی شاہ کو کلکتہ نظر بند کر دیا۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ فوجی کمیٹی اور دیگر افسران اور بیگمات کی صلح سے برجیس قدر کو ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو تخت نشین کیا گیا۔ بیگم حضرت محل کو مختار کل بنایا گیا۔ بیگم نے ہر طرح سے سب کے ساتھ اہم رول ادا کیا۔ تن، من، دھن سے تعاون فرمایا۔

رانی لکشمی بائی کی طرح خواتین فوجی دستہ تیار کیا۔ مختلف راجاؤں سے تعاون حاصل کیا۔ بقول امبریش کشور ۲۵/ فروری ۱۸۵۸ء میں گومتی کے کنارے موسیٰ باغ میں لڑائی ہوئی۔ بیگم نے مردانہ لباس میں خود ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ کی قیادت کی اور فوجیوں کا حوصلہ بڑھایا، لیکن وہیں انگد تیواری، میر واجد علی، خورد محل اور قنوجی لال جیسے افراد نے غداری بھی کی اور انگریزوں سے جا ملے۔ نیپالی اور سکھ و جاٹوں کی کمک آ پہنچی تو انگریز کرنل کیمبل بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا۔ (نیا دور لکھنؤ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر اپریل مئی ۲۰۰۷ء۔ ص ۶۷) بقول شکیل صدیقی، انگریز افسر ہڈسن لکھنؤ کے حضرت گنج میں گرفتار ہو کر سزائے موت دینے کا اعلان ہوا۔

(نیا دور لکھنو انقلاب غدر ۱۸۵۷ء نمبر ص ۶۳)۔ وسیم احمد سعید اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں: "بیگم نے انگریزوں کے خلاف جب اعلان جنگ کیا تو ان کے ساتھ ہندو، مسلمان برابر سے شریک ہوئے۔ ہندو امرا نے بیگم حضرت محل کو راج ماتا کا درجہ دیا اور آخر تک ان کے ساتھ جنگ کی (بیگم حضرت محل۔ ۲۰۰۶ء)۔

واقعی بیگم نے بڑی بہادری، شجاعت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ راجاؤں، فوج، زمینداروں اور عوام کو اپنی تقریر سے متاثر کرتی تھیں۔ بارہ بنکی حضرت پور کی میٹنگ میں بہت جوشیلی تقریر کی۔ جس سے ان کا بلند عزم و حوصلہ اور منظّم ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ امرت لال ناگر اپنی تصنیف غدر کے پھول میں لکھتے ہیں۔ مہادیوا میں اپنی مؤثر تقریر سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ہزاروں ہندو مسلمانوں کا تلواریں اٹھا کر ملک کے لئے اپنی جان قربان کر دینے کی قسمیں کھانا دل میں واقعی پر کیف منظر پیش کرتا ہے۔ (ص ۱۴۲)۔ سر ولیم رسل نے بھی لکھا ہے کہ اودھ کی رعایا میں بڑے پیمانے پر یہ یقین مستحکم ہو گیا ہے کہ بیگم پوری ریاست کی آبادی اور بقا کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ یہ بھی لکھا کہ بیگم اپنے شوہر سے زیادہ مرد ہیں۔ (بیگم حضرت محل۔ شکیل صدیقی۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر اپریل مئی ۲۰۰۷ء۔ ص:۶۱)

ان سب کارناموں کی وجہ سے ہی مولوی فضل حق خیر آبادی نے اپنی تصنیف 'خواتین ہند کے تاریخی کارنامے' میں بیگم حضرت محل کو ذہین، بہادر اور دور اندیش خاتون کہا ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ ان حالات میں فوج کمیٹی کا مشورہ قبول کیا۔ برجیس قدر کو تخت نشین کر کے خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن انگریزوں سے صلح نہیں کی اور غلامی میں رہنا پسند نہیں کیا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی

جنگ آزادی میں شجاعت وعزیمت کا سکہ ثبت کیا۔ان کی شخصیت، بہادری، عزم وحوصلہ، مجاہدین آزادی کے لئے روشن قدم ثابت ہوا۔آخر میں نریش کمار کی نظم 'اے حریت کی روح رواں تجھ پرصد سلام' پیش کرتا ہوں جس میں عظیم مجاہدہ آزادی کو صد سلام پیش کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''بیگم حضرت محل: تجھ پہ صدہا سلام''

اے حریت کی روح رواں تجھ پہ صدہا سلام
تاریخ میں اودھ کی ہے اعلیٰ ترا مقام
جب بھی عدو کی فوج سے ٹکرائی تھی یہاں
ظلمت کدوں میں برق سی لہرائی تھی یہاں
اے حریت کی روح رواں تجھ پہ صدہا سلام
ہاتھی پہ بیٹھ کر گئی میدان جنگ میں
جنرل کا تھا جواب بھی تیغ و تفنگ میں
آزادی وطن کی ہے تو مادرِ عزیز
کرتے ہیں آج دل سے سب ہی ترا احترام
اے مادرِ وطن تری ہمت پہ زندہ باد
حضرت محل کی شان شجاعت پہ زندہ باد

(بیگم حضرت محل۔وسیم احمد،سعیدص:۱۴۰)

حوالہ واستفادہ کتب:

(۱) شان اودھ۔بیگم حضرت محل۔وسیم احمد سعید (بنگالی مارکیٹ۔نئی دہلی ۲۰۰۶ء)

(۲) نامور مغل شہزادیاں ۔ (ناقابل فراموش واقعات) طلحہ علی (جون ۲۰۰۴ء۔ناشر فرید بک ڈپو۔نئی دہلی)

(۳) نیا دور لکھنؤ۔انقلاب ۱۸۵۷ء اپریل مئی ۲۰۰۷ء۔(لکھنؤ، یوپی۔)

(۴) مسلم خواتین تحریک آزادی (از بلال احمد میر۔ ماہنامہ خواتین دنیا۔اگست ۲۰۱۸ء)

(۵) گولڈن تاریخ۔(برائے نصاب ہائی اسکول)

☆☆☆☆☆☆

Opp. Maulana Azad College, Dr. Zakariya Road,
National Colony, Plot No. 34,
Aurangabad-431001 (Maharashtra)
Mobile: 9890204715

ایک عظیم سپہ سالار
جنرل بخت خان

طٰہٰ النسیم......

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کا سب سے بڑا ہیرو جسے اپنوں نے لاعلمی اور غیروں نے تعصب کی بنا پر نظر انداز کیا وہ جنرل بخت خان ہے۔ اس عظیم جنرل نے بندیل کھنڈ، لکھنؤ اور دہلی کے محاذوں پر اپنی بہادری اور جنگی مہارت کے سبب انگریزوں کو کئی مرتبہ شکست دی۔ وہ ہماری جنگ آزادی کا ایسا عظیم کردار ہے جو پوری زندگی انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا اور کبھی ہاتھ نہ آیا۔ اس نے شہروں، دیہاتوں، قصبوں، قلعوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں انگریز سامراج سے جنگ کی نہ تو اس کے پائے استقلال میں لرزش ہوئی نہ اس نے کبھی ہتھیار ڈالے۔ جنرل بخت خاں انگریزوں کی فوج میں توپ خانے کے افسر تھے۔ انگریزوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا توپخانہ تھا جو ہر محاذ پر ہندوستانی مجاہدین کو نقصان پہنچاتا تھا۔ جنرل بخت خان نے توپوں کی جنگ میں مہارت حاصل کر لی اور جب ۱۸۵۷ میں عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو جنرل بخت خان بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف ہوگئے۔ انھوں نے کئی انگریز افسروں کو مار ڈالا اور درجن بھر توپیں لے کر بندیل کھنڈ میں خان بہادر کے ساتھ آ کر مل گئے۔ خان بہادر کے ساتھ بندیل کھنڈ کے ہزاروں بہادر تھے۔ ان میں بڑی تعداد عوام کی بھی تھی جو انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ جنرل بخت خان کے بندیل کھنڈ پہنچنے سے نواب خان بہادر خان کو بڑی تقویت ملی، بریلی اور آس پاس کے علاقوں میں انگریز فوجی یا تو مارے گئے یا جان بچا کر بھاگ گئے۔ 31 مئی کو بندیل کھنڈ میں تعینات آٹھویں بٹالین کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور وہاں تعینات جنرل براؤن کا بنگلہ نذر آتش کر دیا۔ اس معرکہ میں ہندوستانی سپاہیوں نے بڑی بہادری دکھائی اور دوپہر تک انگریزوں کو شکست ہوگئی۔ سیکڑوں انگریز سپاہی مارے گئے اور باقی جان بچا کر بھاگ گئے، لوگوں نے جنرل براؤن اور دیگر انگریز افسران کے بنگلوں میں آگ لگا دی۔ مسلمانوں کی طرف سے مفتی سید احمد اور ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے دیوان شوبھا رام سکسینہ نے خان بہادر خان کو بندیل کھنڈ کا نواب بنا دیا۔

شام کو شاندار جلوس نکالا گیا جس میں جنرل بخت خان، مفتی صاحب اور دیوان صاحب آگے آگے چل رہے تھے۔ بریلی کے عوام فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ بریلی کی فتح کی خبر دہلی پہنچی تو بہادر شاہ ظفر نے خان بہادر خان کو مبارکباد بھیجی اور انھیں کچھ تحفے بھی دیے۔ خان بہادر خان نے اقتدار سنبھالتے ہی بندیل کھنڈ کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے فوج روانہ کی۔ اس وقت نیپال کا راجہ اور رامپور کا نواب یوسف علی خان انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ہندوستانی فوج کی نیپال اور رامپور کی فوجوں سے بھی جھڑپیں ہوئیں۔

۱۱ مئی کو جنرل دہلی میں آ گئے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی آمد کے ساتھ ہی بغاوت شروع ہوگئی تھی۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا مغل کمانڈر مقرر کیے گئے لیکن انھیں جنگ لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ حالانکہ دلی کے عوام اور سپاہی بڑی بہادری سے کشمیری دروازے، لاہوری دروازے، اجمیری دروازے اور کیلا گھاٹ کے محاذوں پر ڈٹے ہوئے تھے، لیکن قابل فوجی قیادت کی کمی اور مناسب سامان حرب نہ ہونے کے سبب وہ انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے انگریز لوڈلو کیسل اور ہندوراؤ کی پہاڑیوں پر مورچہ بندی کر کے شہر پر گولہ باری کر رہے تھے۔

ادھر بندیل کھنڈ میں خان بہادر خان کے سپاہیوں نے کافی بڑا علاقہ فتح کرلیا تھا۔ ملک پر حکومت کرنے کے لحاظ سے دہلی کی خاص اہمیت تھی اور اسے محفوظ رکھنا مجاہدین کی اولین ذمہ داری تھی۔ خان بہادر خان نے اسی جذبہ کے تحت جنرل بخت خان کو ایک لاکھ روپے اور پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ دہلی روانہ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جنرل اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۲۶ جون کو دہلی پہنچے اور کچھ تاریخ داں ۲ جولائی کو دہلی آمد دکھاتے ہیں۔ وہ سیدھے بہادر شاہ ظفر سے ملنے لال قلعہ پہنچے اور خان بہادر خان کا خط اور روپے ان کے حوالہ کرتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق بندیل کھنڈ کے شاہی خاندان سے ہے۔ میں نے انگریزوں کے ساتھ کام کرکے ان کی جنگی تکنیک سیکھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر جنرل بخت خان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ ایک نیک دل اور وطن پرست بادشاہ تھے انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے لڑکے محاذ جنگ پر قیادت کے اہل نہیں ہیں اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو ہٹا کر جنرل بخت خان کو سپہ سالار جنگ بنادیا اور اعلان کر دیا کہ سبھی سپاہی اور شہزادے جنرل بخت خان کا حکم مانیں گے۔

مولوی ذکاءاللہ دہلوی رقمطراز ہیں:

''۲رجولائی کو بخت خان بادشاہ کے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے فوج کا کماندران چیف بنادیا۔ آپ میگزین (توپخانہ) دیکھتے ہیں اور اس پر سامان ترتیب وار رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ انھوں نے لال ڈگّی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں فوجیوں کی پریڈ لی۔ نمک اور شکر سے محصول معاف کیا اور یہ اعلان کرا دیا کہ جو شہزادہ شہر کو لوٹے گا اس کی ناک کٹوادوں گا''۔

انھوں نے جامع مسجد دہلی میں علما کا اجلاس طلب کیا جس میں سبھی مسالک کے علما جمع ہوئے اور سب نے اعلان کیا کہ اب مسلمانوں پر جہاد فرض ہوگیا ہے۔ اعلان کے بعد دہلی کے عوام میں بھی جوش بھر آیا اور ایسے نوجوان جنھوں نے کبھی تیر وتفنگ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا یا جو طالب علم تھے وہ فوجی تربیت حاصل کرنے لگے۔ جنرل نے پانچ توپیں اور سیکڑوں سپاہی کشمیری گیٹ کے محاذ کی جانب روانہ کیے۔ ان فوجیوں نے بڑی بے جگری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندوستانی سپاہ نے کشمیری گیٹ سے باہر نکل کر انگریزوں پر حملہ کیا اور کئی انگریزوں کو ہلاک کر دیا اور درجنوں زخمی ہوئے۔ جنرل بخت کے دہلی پہنچنے اور جہاد کا اعلان کرانے کے بعد کافی تعداد میں علما دہلی پہنچنے لگے اور مجاہدین کی صفوں میں شامل ہوگئے۔

جنرل بخت خان نے دہلی میں امن قائم کیا۔ بعض مکّار لوگ خود کو سپاہی کہہ کر یا سپاہیوں کی وردی پہن کر دکانداروں اور مالداروں کو لوٹتے تھے۔ جنرل بخت خان نے ایسے لوگوں کو گرفتار کرا کر سخت ترین سزائیں دیں۔ انھوں نے تاجروں اور مالدار لوگوں کو یقین دلایا کہ آپ بے خوف ہوکر کاروبار کریں۔ اگر کوئی آپ کو پریشان کرے تو براہ راست مجھ سے شکایت کریں۔

جنرل بخت خان کے ساتھ آنے والے فوجی نظم وضبط کے پابند اور اپنے کمانڈر کے تابعدار تھے۔ انھوں نے بڑی بہادری سے دہلی کے مختلف محاذوں پر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ جب جنرل بخت خان کو کامیابی ملنے لگی تو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے ان سے حسد کرنے لگے اور انھوں نے جنرل کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ کوئی کہتا کہ جنرل کامیاب ہوگیا تو وہ ہماری حکومت ختم کرکے پٹھانوں کی حکومت قائم کردے گا جیسا شیر شاہ سوری نے ہمایوں سے اقتدار چھین لیا تھا۔ کوئی شہزادہ کہتا کہ جنرل یہاں ہماری مدد کے لیے نہیں بلکہ ہماری حکومت ختم کرنے آیا ہے۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے جنرل بخت خان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنی شروع کردی۔ حسد کی آگ میں وہ اتنے اندھے ہوچکے تھے کہ وہ آزادی کی جنگ بھول کر جنرل بخت خان کو کمزور کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ابتدا میں جنرل کی قیادت میں مجاہدین کو کامیابی حاصل ہوئی لیکن نمک حراموں کی غداری اور شہزادوں کی نالائقی کے سبب ڈھائی مہینے بعد ہی دہلی بہادر شاہ کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس وقت بہادر شاہ کے خاندان اور محل میں کافی غدار موجود تھے۔ جو انگریزوں کو مجاہدین کی مورچہ بندی، اسلحہ کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ ان غداروں میں بہادر شاہ ظفر کا سمدھی مرزا الٰہی بخش، رجب علی، گوری شنکر، جیون لال، تراب علی، جواہر سنگھ، لطافت علی، میگھ راج اور رستم علی پیش پیش تھے۔ رجب علی نے تو لال قلعہ کے گودام میں آگ لگا کر سارا بارود جلوا دیا تھا۔ اس دھماکہ

میں درجنوں ہندوستانی سپاہی بھی ہلاک ہوئے تھے۔ مرزا الٰہی بخش ہر اجلاس میں شرکت کرتا اور اس میں کیا فیصلہ ہوا اس کی خبر انگریزوں کو پہنچا دیتا۔ جنرل بخت خان کو جب اس کی حرکتوں کا علم ہوا تو اسے گرفتار کرالیا۔ لوگوں نے اس کی حویلی لوٹ لی اور اسے جان سے مارنا چاہتے تھے لیکن بہادر شاہ ظفر نے بیچ میں پڑ کر اس کی جان بچالی اس کے باوجود یہ غدار نمک حرامی سے باز نہیں آیا۔

اس کے علاوہ شہزادے جس طرح بخت خان کے کاموں میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ اپنے لوگوں کے ذریعے ان کے فوجیوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کررہے تھے اس سے جنرل بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے ان کی شکایت بھی کی۔ ۳۰ / جولائی کو ایک فرمان جاری کر کے شہزادوں کو تمام فوجی خدمات سے ہٹا دیا گیا۔ بادشاہ نے دہلی اور اطراف کے ساہوکاروں سے روپیہ ادھار لینے کی ذمہ داری بھی جنرل بخت خان کے سپرد کردی۔

جب شہر میں گولہ بارود ختم ہوگیا۔ اناج اور دوسری اشیائے خورد ونوش کی کمی ہوگئی تب بھی چھوٹی توپوں اور معمولی ہتھیاروں کے ساتھ جنرل کے سپاہی انگریزوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ غداروں اور درباری سازشوں کے پروپیگنڈہ سے بددل ہوکر کافی تعداد میں سپاہی دہلی چھوڑ کر جانے لگے۔ جبکہ انگریزوں کو برابر مدد ملتی رہی۔ یہاں تک کہ مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ نیپال، نظام حیدرآباد، مہاراجہ کشمیر جیسے کئی وطن فروش نوابوں اور راجاؤں نے انگریزوں کی مدد کے لیے اسلحہ اور فوج بھیجی۔ اتنی بڑی اور جدید ہتھیاروں سے مسلح فوج کا مقابلہ مشکل ہوگیا۔ شہر پر بمباری شدید ہوگئی اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی جاں بحق ہونے لگے۔ ان حالات میں بخت خان زیادہ دن مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی چھوڑ کر ان کے ساتھ چلیں۔ وہ دوسری جگہ فوج جمع کر کے مقابلہ کریں گے لیکن بہادر شاہ ظفر مرزا الٰہی بخش کے بہکاوے میں آگئے جس نے انھیں انگریزوں سے معافی دلوا کر دوبارہ تخت نشیں ہونے کا یقین دلایا۔ سقوط دہلی والے دن جنرل بخت خان اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں جا کر حضرت محل کے ساتھ شامل ہوگئے۔ بیگم حضرت محل کے دربار میں بھی غداروں کا ٹولہ تھا جس کے سبب ۱۸۵۸ میں مجاہدین کو لکھنؤ بھی کھونا پڑا۔ اس کے بعد بخت خان مولوی احمد اللہ شاہ کے ساتھ شاہجہاں پور، بریلی اور کئی علاقوں میں انگریزوں اور غداران وطن سے مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے ترائی کے جنگلوں میں چھپ کر انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھی اور جب بھی موقع ملا انھوں نے انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔

2793, Pahari Bhojla, Delhi-110006
Mobile: 9560291230

عظیم مجاہد آزادی: حکیم اجمل خاں

......ڈاکٹر معین الدین شاہین

حکیم محمد اجمل خاں کا شمار ان مایۂ ناز شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ملک وقوم کا نام روشن کیا۔ انھیں ماہر طب، مجاہد آزادی، قابلِ قدر صحافی، سرگرم عمل سیاست داں اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ اجمل خاں حکیموں اور طبیبوں کے عالمانہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس گھرانے کو ان کے دادا حکیم محمد شریف خاں کے نام کی رعایت سے ''شریفی خاندان'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

یہ خاندان مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان آکر آباد ہوا۔ اس گھرانے کو ہمیشہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حکیم اجمل خاں کے دادا محمد شریف خاں جنھیں ''رئیس دہلی'' کہا جاتا تھا، مغل بادشاہ شاہ عالم کے ''طبیب خاص'' کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ''شریف منزل'' نامی ایک عمارت تعمیر کرواکر اس میں ایک ''شفاخانہ'' اور کالج قائم کیا جہاں طب یونانی سے متعلق تعلیم دی جاتی تھی اور غریب مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ ''شریف منزل'' پورے برصغیر میں علم طب کا مقبول ومعروف ادارہ تھا۔

حکیم محمود خاں کے صاحبزادے حکیم محمد اجمل خاں کی پیدائش ۱۱ر فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں ہوئی۔

حکیم اجمل خاں نے روایت زمانہ کے مطابق دینی اور دنیوی تعلیم یکساں طور پر حاصل کی۔ انھوں نے ایک طرف قرآن مجید حفظ کیا اور دوسری طرف عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ اپنے اہل خاندان حکیموں، طبیبوں اور عالموں کی نگرانی میں طبابت یونانی کی تعلیم کا آغاز کیا جس کی تکمیل دہلی کے ''صدیقی دواخانہ'' کے حکیم عبدالجمیل کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔

حکیم اجمل خاں کی غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر ۱۸۹۲ء میں نواب رام پور نے انھیں اپنا ''معالج خاص'' مقرر کیا۔ اس زمانے میں حکیم صاحب کو ''مسیحائے ہند''، ''بے تاج بادشاہ'' اور ''مسیح الملک'' جیسے القاب و خطابات سے یاد کیا جاتا تھا۔ قدرت کی طرف سے انھیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ مریض کا چہرہ دیکھ کر اس کی بیماری کا پتہ لگا لیتے تھے۔ اپنے دادا محمد شریف خاں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے حکیم اجمل خاں نے بھی تین مشہور زمانہ طبی ادارے قائم کیے جن میں ''سینٹرل کالج''، دہلی ''ہندوستانی دواخانہ'' اور '' آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج'' کا شمار بطور خاص ہوتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے حکیم اجمل خاں ماہر تعلیم کی حیثیت بھی رکھتے تھے تاہم انھوں نے ''ندوۃ العلما'' کے ذریعہ مذہبی اموراور تعلیم کو عام کرنے میں پیش رفت کی۔ علاوہ ازیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں کے ساتھ مل کر اس ادارے کے قیام میں بنیادی کام کیا۔ ان کی خداداد صلاحیتوں کے پیش نظر ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو اتفاق رائے سے انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا چانسلر منتخب کیا گیا اور وہ تاحیات یعنی ۱۹۲۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ واضح ہو کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرانے کا سہرا بھی حکیم اجمل خاں کے سر جاتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ اس وقت ایسا ادارہ تھا جو معاشی بدحالی کا شکار تھا، لیکن حکیم اجمل خاں نے اس ادارے کے لیے جگہ جگہ سے مالی تعاون حاصل کرنے کی جی توڑ کوشش کی۔

صحافت بھی حکیم اجمل خاں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کے بیشتر اہل خاندان علم وصحافت سے وابستہ تھے۔ ان حضرات نے ہفتہ وار ''اکمل الاخبار'' (اردو) کا اجرا کیا تھا۔ حکیم صاحب نے اس اخبار میں مختلف موضوعات پر مضامین و مقالات سپرد قلم کرکے اپنی صحافتی سرگرمی کا ثبوت فراہم کرایا۔

حکیم صاحب بہت فراخ دل انسان تھے۔ وہ تمام مذاہب اور اقوام کے لوگوں کا احترام کرتے تھے۔ قومی یکجہتی اور وطن پرستی کی تحریک کو مضبوط و

مستحکم کرنے کی غرض سے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم حضرات بھی ان کی عزت وتکریم کرتے تھے۔ان کے احترام کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ''ہندو مہاسبھا'' نے انھیں اپنے پروگرام کا صدر بنایا جہاں حکیم صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں صاف طور پر کہا تھا کہ ہندو۔مسلم اتحاد پر زور دیا جائے۔ کسی قسم کے اختلاف کو ان دونوں قوموں کے درمیان بڑھنے نہ دیا جائے۔

مجاہد آزادی کی حیثیت سے بھی حکیم صاحب انفرادی کارناموں کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں ان کی مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے چنانچہ جب گاندھی جی نے ''عدم تعاون'' اور ترکِ موالات'' کی تحریکیں چلائیں تو حکیم صاحب نے گاندھی جی کی ہمنوائی کی۔اسی طرح مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر نے جب ''تحریک خلافت'' کے پروگرام کیے تو حکیم صاحب نے وہاں بھی اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔واضح ہو کہ ان کی سرگرم عمل شخصیت سے متاثر ہو کر ہی ان کو ''آل انڈیا خلافت کمیٹی'' کا صدر بنایا گیا تھا۔تحریک آزادی کے دنوں میں جب ''جمعیۃ علماء ہند'' نے علم جہاد بلند کیا تو حکیم صاحب بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے۔ وہ ہندوستانی مجاہدوں کے ہمراہ جیل میں ڈالے گئے۔حکیم صاحب کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، موتی لال نہرو، جواہر لعل نہرو اور لالہ لاج پت رائے وغیرہ سے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔

زندگی بھر دل کے مریضوں کا علاج کرنے والے حکیم اجمل خاں کا انتقال دل کی بیماری کے سبب ۲۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ان کے انتقال کی خبر سے پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔جگہ جگہ تعزیتی جلسے منعقد ہوئے جہاں حکیم صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کے پیشِ نظر مرحوم کی تعریف وتوصیف کی گئی۔

395-A, Azad Nagar, Kotra, Pushkar Road,
Ajmer-305001 (Rajasthan)

یومِ آزادی

.......ڈاکٹر ابوطالب انصاری

بچو! کل ۱۵؍اگست ہے۔ٹیچر نے بچوں کو پڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کی کیا خاص بات ہے؟ایک بچے نے فوراً جواب دیا ''اس دن ہمارا ملک آزاد ہوا تھا''۔ دوسرے نے کہا اس دن ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔شاباش۔اس دن کیا کیا جاتا ہے؟۔اس دن سویرے جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے اور قومی ترانہ گایا جاتا ہے۔ہاں۔راشدتم بتاؤ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔اس کے بعد چھٹی ہو جاتی ہے۔سارے بچے ہنسنے لگے۔خاموش! ٹیچر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔اچھا یہ بتاؤ، جھنڈا کب لہرایا جاتا ہوتا ہے؟۲۶؍جنوری کو ایک بچے نے کہا۔دوسرے نے کہا ۱۵؍اگست کو۔دونوں میں کیا فرق ہے؟ کلاس میں خاموشی رہی کسی نے جواب نہیں دیا،اچھا یہ بتاؤ جھنڈے کا ڈیزائن کس نے تیار کیا ہے؟۔اب بھی کلاس میں خاموشی رہی۔ٹیچر نے کہا کوئی بات نہیں۔میں یوم آزادی اور جھنڈے سے متعلق ساری باتیں بتاتی ہوں۔

''انگریزوں سے پہلے ہمارے ملک پر مغلیہ خاندان کی حکومت تھی۔ ان کی حکومت ۳۳۱ سال تک رہی۔ان کے دور میں ہندوستان بہت خوشحال تھا۔ انہی لوگوں نے لال قلعہ اور تاج محل جیسی خوبصورت عمارتیں بنوائی تھیں۔ انگریز ہمارے ملک میں تجارت کی غرض سے آئے مگر دھیرے دھیرے حکومت پر قابض ہو گئے۔انگریز چالباز تھے،مگر وہ اپنے ساتھ انگریزی لائے تھے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم،سائنس اور ٹیکنالوجی اور صنعتی انقلاب بھی ساتھ لائے۔ اگر وہ نہ آتے تو ہمارے ملک میں نہ انگریزی آتی اور نہ ہی سائنسی ایجادات۔ جب وہ لوگ اپنے ساتھ اتنی ساری اچھی چیزیں لے کر آئے تھے تو کیوں ہمارے لیڈروں نے انہیں مار بھگایا۔ایک بچے نے سوال کیا۔جو بھی ہو،غلامی غلامی ہوتی ہے۔اس سے آزادی ضروری تھی۔اس کے لئے ہمارے لیڈر بھگت سنگھ،اشفاق اللہ خان،گاندھی جی،پنڈت جواہر لعل نہرو،ولبھ بھائی پٹیل،ابوا لکلام آزاد،خان عبدالغفار خان وغیرہ نے قربانیاں پیش کیں۔تب جا کر ملک ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا اور ہم ہندوستانیوں کی حکومت قائم ہوئی۔''

ٹیچر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اس دن صبح کے وقت لال قلعہ پر وزیر اعظم جھنڈا لہراتے ہیں اور قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ہمارے جھنڈے میں تین رنگ ہیں۔کیسری (اوپر)، سفید (درمیان) اور ہرا (نیچے)۔کیسری رنگ طاقت،ہمت اور قربانی کی علامت ہے،سفید رنگ امن،خلوص،ایمانداری اور نئی شروعات جبکہ ہرا رنگ عقیدت،انکساری اور زمین کی زرخیزی کی علامت ہے۔درمیان میں اشوک چکر ہے۔جس میں ۲۴ لکیریں ہیں۔جس کے مرکز میں نیوی بلیو رنگ ہے۔ اشوک چکر راجہ اشوک کی نشانی ہے۔اشوک چکر وقت کا پہیہ ہے اور ۲۴ لکیریں ۲۴ گھنٹے ہیں اور اس بات کی علامت ہے کہ حرکت میں زندگی ہے جبکہ رکنا موت کی علامت ہے۔ہمارے جھنڈے کا ڈیزائن بیگم طیب جی نے بنایا ہے۔ جھنڈا مستطیل ہے۔جھنڈے کے سائز کا تناسب ۲:۳ کا ہوتا ہے۔جھنڈے کے دستے کا معیاری سائز ۳۰ فٹ ہوتا ہے۔(مگر یہ جھنڈے کے سائز کے مطابق ہو سکتا ہے)۔جھنڈا صبح سے سورج ڈوبنے تک لہراتا رہتا ہے یوم جمہوریہ پر جھنڈا راج پتھ میں صدر لہراتے ہیں۔یوم جمہوریہ پر جھنڈا دستے کے نیچے بندھا ہوا ہوتا ہے اور اسے رسی سے کھینچ کر دستے کے اوپر لا کر لہرایا جاتا ہے۔'' اتنا کہہ کر ٹیچر خاموش ہو گئی۔سارے بچے خاموشی سے ٹیچر کی بات سن رہے تھے۔ٹیچر کے خاموش ہوتے ہی ایک بچے نے کہا ٹیچر انگریزوں نے ٹرین،بجلی،فریج،اے سی،انٹرنیٹ،کمپیوٹر،ہوائی جہاز وغیرہ چیزیں ایجاد کی ہیں تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟۔تمہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ستاروں اور سیاروں کی کھوج کرنا چاہئے۔ستاروں سے آگے جہاں تلاش کرنا چاہئے۔ موبائل،کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تو ایجاد ہو چکے ہیں۔تمہیں ٹیکنالوجی کے نئے آلات ایجادات کرنا ہے۔ہمارے ملک کو اچھے ڈاکٹر،وکیل،انجینئر،سائنسداں،خلاباز، سول سروس والوں کی ضرورت ہے اور اس سے بڑھ کر تمہیں اچھا انسان بننا چاہئے تاکہ اپنے ملک اور قوم کا نام روشن کرو۔ایسے کام کرنا ہے جس سے انسانیت کو فائدہ پہنچے سارے بچوں نے ایک ساتھ کہا کہ ٹیچر ہم عہد کرتے ہیں ہم ایسے کام کریں گے جس سے ہمارے ملک کا نام روشن ہو۔

Bhiwandi (Thana), Maharashtra
Mobile: 9823755795

آزادی کا پیغام

......ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی

پیارے بچو! ہم ہندوستانیوں پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب یہاں غیر ملکیوں کی حکمرانی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت زیادہ طاقتور اور بہادر تھے۔ بلکہ انھوں نے مکاری، فریب اور چال بازی سے یہاں پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور پھر ظلم وستم اور جبر و بربریت کا ایسا بازار گرم کیا جس کا ذکر بھی اب ہمارے لئے تکلیف کا باعث ہے۔ وہ لوگ ہمیں آپس میں لڑانے کے ساتھ ہی، ہمارے حقوق بھی دباتے تھے اور طرح طرح سے ہم کو پریشان بھی کیا کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ ایسا وقت تھا جسے سوچ کر آج بھی کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ دل تڑپ اٹھتا ہے اور روح کانپ جاتی ہے۔

انسان تو پھر انسان ہے، اس ظلم و بربریت پر حیوان بھی تلملا اٹھے۔ انگریز کے ظلم سے تنگ آ کر ایک دن ہندوستان کے لوگ بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے غلامی کے خلاف آزادی کا بگل بجا دیا۔ خوشی کی بات تو یہ کہ اس وقت انھوں نے زبردست اتحاد و محبت کا ثبوت دیا۔ آزادی کی اس جنگ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ سب ہی ساتھ کھڑے تھے اور کاندھے سے کاندھا ملا کر آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ ان کے پاس اس وقت نہ تو مال و دولت ہی تھی اور نہ اسلحہ و ہتھیار۔ اس وقت تو ان کا اتحاد ہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ جس کی بنیاد پر وہ یہ جنگ لڑے اور انھوں نے اس میں فتح بھی حاصل کی۔

جنگ خواہ ملکوں کی ہو یا عوام کی۔ اس کے لئے قیادت اور رہنمائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس جنگ کی قیادت ہمارے کچھ ایسے رہنما کر رہے تھے جن کے اندر ایثار، خلوص اور وطن کے لئے پیار و محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان میں سرِ فہرست تو مہاتما گاندھی کی ذات تھی، جن کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، اشفاق اللہ خاں، مولانا محمد علی جوہر، پنڈت جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، چندر شیکھر آزاد، رام پرساد بسمل، اور پنڈت میلا رام وفا وغیرہ بھی شامل تھے جن کی قیادت میں یہ جنگ لڑی گئی۔ بچّو! یہ سن کر تم کو حیرت ہوگی کہ یہ جنگ ایسی جنگ تھی، جس میں ہندوستانیوں کی جانب سے کسی طرح کا اسلحہ استعمال نہیں کیا گیا۔ کوئی فوج نہیں بنائی گئی۔ نہ زیادہ خون بہا اور نہ ہی کوئی بڑی تباہی ہوئی۔ بلکہ یہ جنگ صرف احتجاج و تحریکوں کے ذریعے عدم تشدّد کی بنیاد پر لڑی گئی۔ اسی لئے تو اس کو اہنسا کی جنگ کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے، ایسی جنگ جس میں کسی طرح کا تشدّد، مار کاٹ اور خون خرابہ نہ ہو۔ یہ دنیا کی اپنی نوعیت کی پہلی ایسی جنگ تھی جس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ ایک ظالم اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

یہاں پر یہ بھی ضروری ہے کہ آزادی کی اہمیت کو واضح کرتا چلوں۔ دراصل آزادی ہمارا فطری حق ہے اور یہ صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر ایک جاندار کو ہی اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب ہم کسی پرندے کو پکڑتے ہیں تو وہ آزاد ہونے کے لئے اپنی بساط بھر کوشش کیا کرتا ہے۔ کسی جانور کو رسّی سے باندھا جائے تو وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ چیونٹی جیسا حقیر و چھوٹا کیڑا بھی اگر پکڑ لیا جائے تو آزادی حاصل کرنے کے لئے بھرپور کوشش کرتا ہے اور پکڑنے والے کو اپنا ننّھا سا ڈنک ہی مار دیتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی بہت سی جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ آزادی ہر ایک کو ہی عزیز ہوتی ہے۔ اس کی ایک بہت ہی عمدہ مثال ڈاکٹر ذاکر حسین کی کہانی ''ابو خاں

کی بکری''میں دیکھنے کو ملتی ہے۔جس میں ان کی بکری ''چاندنی''
آزادی کی خواہش میں پہاڑوں میں چلی جاتی ہے اور وہاں بھیڑیے
سے لڑکر اپنی جان تو دے دیتی ہے مگر ابو خاں کی قید میں رہنا پسند نہیں
کرتی۔یہ تو حیوانات کا حال ہے۔انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ
غلامی کو کیوں کر برداشت کرسکتا ہے۔

ہماری آزادی کی تاریخ بڑی دلچسپ بھی ہے اور دلخراش بھی۔
دلچسپ اس لئے کہ اس موقع پر ہمیں ہندوستانیوں میں زبردست اتّحاد
دیکھنے کو ملا۔اس وقت نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔نہ سکھ، نہ عیسائی۔اسی
طرح مختلف علاقوں کے رہنے والے سارے ہی ہندوستانی آزادی کے
جھنڈے کے تلے متّحد تھے۔الگ الگ زبان بولنے والے اور مختلف
رنگ ونسل کے لوگ بھی ایک ہی قیادت کے تحت جنگ آزادی میں
مصروف تھے۔اس وقت کسی میں بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔کسی بھی طرح
کا انتشار نہ تھا۔ہر ایک ہندوستانی آزادی کے جذبے سے سرشار
رہبرانِ آزادی کے پیچھے پیچھے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا دراصل یہ
اتّحاد ہی تو تھا جس کی وجہ سے ہمیں آزادی کی صبحِ بہاراں نصیب ہوئی۔
میل جول اور پیار، محبت کی اسی طاقت کے زیرِ اثر ہی تو ہمارے چمن
میں آزادی کے پھول کھلے۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اتّحاد میں زبردست
طاقت ہے اور اس کے ذریعے بڑے بڑے معرکے سر کئے جا سکتے
ہیں۔بڑی بڑی جنگیں جیتی جاسکتی ہیں۔دراصل اتّحاد کی ضرورت
صرف جنگوں میں ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کو ہر وقت اور ہر موقع پر ہی
محسوس کیا جاتا ہے۔آج جب کہ ہمارا وطن آزاد ہوچکا ہے اور اس سال
ہم آزادی کی پچھترویں سالگرہ منا رہے ہیں۔آج بھی اتّحاد کی سخت
ضرورت ہے۔اسی ضرورت کو سمجھتے ہوئے ہی تو ان سطور کو تحریر کیا جارہا
ہے۔اسی کے تحت ہی تو میں بچّوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں
ملک کے معمار تم ہی تو ہو۔تم ہی سے تو ملک کی سالمیت اور استحکام ہے
اور تم ہی کو اب اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دینا ہے۔اس لئے اب تم
کو اتّحاد کی اہمیت وطاقت کو اچھّی طرح سمجھ لینا ہے۔خود بھی مل جل کر
رہنا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرنا ہے۔کوشش یہی کرنی ہے کہ
ہمارے درمیان کوئی بھی طاقت نفرت اور انتشار کی دیوار نہ کھڑی کر
سکے۔ہمیں مذہبوں، فرقوں، ذات برادریوں، رنگ ونسل اور زبانوں
کے خانوں میں تقسیم نہ کرسکے۔اگر کوئی ایسا کرتا ہے اور ہم کو لڑانے کا
گناہ کرتا ہے تو ہم سب کومل کر اس کا مقابلہ کرنا ہے اور ملک دشمن
طاقتوں کو اسی طرح شکست دینا ہے جس طرح ہمارے بزرگوں نے متّحد
رہ کر انگریزوں کو شکستِ فاش دی تھی اور وہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر
مجبور ہوگئے تھے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملنے والی آزادی دراصل جہاں ہمارے لیے
خوشخبری اور نوید تھی، وہیں اس آزادی میں ایک پیغام بھی تھا۔یہ پیغام
تھا دوستی کا، پیار کا، محبّت کا اور اتّحاد و یک جہتی کا۔اس سلسلے میں ہمارے
رہبرانِ آزادی مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس، مولانا
ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، محمد علی جوہر، اشفاق اللہ خاں
، سردار بھگت سنگھ، گوپی ناتھ امن، ڈاکٹر مختار انصاری، رام پرساد بسمل کی
قربانیاں اور ان کی خدمات ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔آج بھی ان کی
زندگی کی داستان ہمارے لئے ایک نمونہ ہے جس کے اندر دوستی کا سبق
بھی ہے اور پیار ومحبّت کا پیغام بھی۔جو آج بھی ہم سے یہی کہتی ہے کہ
اے ہندوستان کے لوگو! اگر تم اپنی بقا وسلامتی چاہتے ہو تو سب کومل جل
کر اور متحد ہوکر رہنا ہوگا۔

یہ سب حقائق اپنی جگہ، مگر ہمیں افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب
ہم لوگ اپنے بزرگوں کی ان ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے آپس میں
لڑنے کا گناہ کر بیٹھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر باہم دست وگریباں
ہوجاتے ہیں۔اس طرح ہم اپنا چین وسکون تو غارت کرتے ہی ہیں
وطنِ عزیز کو بھی کمزور کرنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔یاد رکھنا چاہیئے کہ آج
کے موجودہ حالات میں بھی اتّحاد کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس وقت
تھی، جب ہمارے بزرگ انگریزوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے
اور ایک ظالم وطاقتور اقتدار سے برسرِ پیکار تھے۔سوچنے کی بات یہ ہے
کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے اس وقت اتّحاد کا مظاہرہ کرتے

ہوئے انگریز جیسی طاقتور قوم سے آزادی حاصل کی تھی اسی طرح آج ہمیں بھی اسی اتحّاد اور پیار ومحبت کو قائم رکھتے ہوئے اپنی آزادی کی حفاظت کرنی ہے۔

پیارے بچو! ہندوستان کے موجودہ حالات اس وقت کتنے نازک اور تشویش ناک ہیں۔ان حالات میں تو اتحّاد کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔اگر ہم ملک کی سلامتی اور اس کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اتحاد کو قائم کرنا ہوگا۔یہ حقیقت ہم لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ وہ قومیں فنا ہو جاتی ہیں جو آپس میں اتحّاد نہیں رکھ پاتیں۔اس لئے ایسے لوگوں سے ہم کو ہوشیار رہنا ہے جو ہم کو آپس میں لڑانے کا گناہ کر رہے ہیں۔وہ لوگ وطن کے مخلص نہیں ہو سکتے جو یہاں کے لوگوں کو مذہب،فرقوں،ذات پات،رنگ ونسل،علاقوں اور زبانوں میں تقسیم کرتے ہوئے ملک کو کمزور کرنے کا گناہ کر رہے ہیں۔آج ہمیں پھر اپنی تاریخ کو پڑھنا ہے۔جنگِ آزادی کو سمجھنا ہے اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو یاد رکھنا ہے۔

ہمیں خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا ملک ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبو ہے۔جن میں پیار بھی ہے،محبّت بھی ہے،دوستی بھی ہے اور اتحاد بھی۔اس چمن کی سلامتی سے ہی خود ہمارا وجود بھی وابستہ ہے۔ہماری زندگی اسی میں پوشیدہ ہے اور ہماری آنے والی نسلوں کی بقا کا انحصار بھی اسی چمن کی آبیاری میں ہے۔وطن سے محبت،یہاں رہنے والوں سے دوستی دراصل یہی ہندوستانی روایات ہیں۔یہی ہماری طاقت ہے، یہی ہماری سلامتی کا باعث ہے۔یہی ہمارے تحفّظ کا ضامن ہے اور یہی ہماری جنگِ آزادی کا پیغام ہے۔جس پر ہمیں عمل کرنا ہے اور اپنے وجود کو قائم ودائم رکھنا ہے۔

Mayan Sarai, Sambhal, Uttar Pradesh
Mobile: 9837826809

مجاہد آزادی رام پرساد بسمل تاریخ کے آئینے میں

......تجمل حسین

غلامی سے انکار ایک ایسا انسانی جذبہ ہے جو ہر باضمیر شخص میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کو بروئے کار لانے کے لیے ہزاروں لوگ برطانوی حکومت کے خلاف سینہ سپر ہو گئے تھے۔ وطن عزیز کے لیے اپنے وجود کی قربانی دینے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے اور اسی فہرست میں ایک نام رام پرساد بسمل کا بھی ہے۔

رام پرساد بسمل کی پیدائش 11 جون 1897 میں یعنی انیسویں صدی کے آخری عشرے میں شاہجہاں پور میں ہوئی۔ رام پرساد بسمل کی شخصیت جہاں سیاسی نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہے وہیں علمی زاویے سے بھی مثالی ہے، وہ نہ صرف ایک انقلابی انسان اور معروف مجاہد آزادی تھے بلکہ وہ معروف شاعر، مترجم، مورخ اور ادیب بھی تھے۔ رام پرساد بسمل اپنے والدین مرلی دھر اور مولمتی کی دوسری اولاد تھے۔ ان سے پہلے مرلی دھر کے گھر میں ایک بیٹے کی ولادت ہو چکی تھی لیکن زندگی کی سانس لیتے ہی اس بچے کو موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ پہلی زندہ اولاد ہونے کی وجہ سے رام پرساد بسمل کو گھر میں بہت پیار ملا۔ والدین نے بچے کو پیار دینے کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں سے بھی جوڑے رکھا۔ ہندی کی تعلیم بچپن میں انہوں نے اپنے والد سے لی۔ ہندی کے علاوہ وہ اردو اور انگریزی زبان سے بھی واقف تھے۔ اسی طرح قانونی علوم کا بھی انھیں علم تھا چنانچہ جب ان پر کاکوری سانحہ میں ملوث ہونے کا مقدمہ چلا تو انھوں نے عدالت میں بذات خود اپنی پیروی کی اور عدالت میں جرح کر کے جج کو بھی حیرت میں مبتلا کر دیا۔

رام پرساد بسمل کے متعلق یہ بات مذکور ہے کہ وہ بچپن میں بہت شرارتی تھے لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں تبدیلی آتی گئی چنانچہ ابھی وہ اپنی زندگی کے دوسرے عشرے میں ہی داخل ہوئے تھے کہ محلے کے ایک پجاری سے ان کی شناسائی ہوگئی اور وہ پابندی سے مندر جانے لگے۔ اسی دوران اس مندر میں آنے والے نمائندے اندر جیت سے ان کا رابطہ ہو گیا اور پھر اندر جیت کے ہی توسط سے انہوں نے آریہ سماج کے بارے میں جانکاری حاصل کی اور اس تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' ان کے مطالعے میں آئی۔ بعد میں رام پرساد بسمل بھی آریہ سماج سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہاں آریہ سماج کے بارے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ تحریک دراصل سوامی دیانند سرسوتی کی قیادت میں مغربی تہذیب کے جواب میں ۱۸۷۵ میں ممبئی کی سرزمین پر قائم کی گئی تھی لیکن بعد میں اس کا صدر دفتر لاہور منتقل کر دیا گیا۔ اس تحریک کے بطن میں اصلاحی نظریہ بھی تھا۔ تعلیم کے میدان میں آریہ سماج نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس تحریک نے تعلیم نسواں کی بھی حمایت کی لیکن اس تحریک کے ممبران مخلوط تعلیم کے حامی نہ تھے۔ انھوں نے ملک کے مختلف حصوں میں دیانند اینگلو ویدک اسکول کا جال بچھایا لیکن اس تنظیم سے وابستہ شدت پسند افراد تنظیم کے اس اقدام سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہریدوار میں گروکل کا قیام کیا۔ اس تحریک کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ شدھی تحریک اسی کے بطن سے وجود میں آئی چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی بنیادوں پر سماج میں زہر گھولنے کا کام کیا تو ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کے دھاگے میں بندھا ہوا سماجی تانا بانا بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔

رام پرساد بسمل ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے ہی والے تھے کہ انگریزی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف ان کے دل میں نفرت کی آگ

بھڑک اٹھی اور وہ عملی طور پر جنگ آزادی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے اور کچھ ہی دنوں میں انہوں نے یہاں کی سیاست اور آزادی کی تحریکات میں ایسا اثر ورسوخ قائم کرلیا کہ ۱۹۱۶ کے آل انڈیا کانگریس کے جلسے میں صدر استقبالیہ پنڈت جگت نارائن ملا کے حکم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے سرعام بال گنگا دھر تلک کا پورے شہر لکھنؤ میں جلوس نکالا اور نوجوانوں کی حمایت حاصل کرلی۔

انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے میں تقریباً دوصدی سے زیادہ کا وقت لگا ہے اور آزادی کے اس راستے میں مختلف اہم اور دردناک واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۲۳ جنوری ۱۷۵۷ سے پلاسی جنگ کی شکل میں عظیم مجاہد آزادی سراج الدولہ نے برطانوی سامراج کے خلاف جو جنگ چھیڑی تھی وہ سو سال بعد ۱۸۵۷ کی بغاوت کی شکل میں ازسرنو نئی اسپرٹ اور نئے جنون کے ساتھ منظر عام پر آئی اور وقت کے ساتھ اس جنگ میں شدت بڑھتی رہی اور بیسویں صدی آتے آتے آزادی کی یہ جنگ اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

جیسا کہ میں پہلے اس بات کا تذکرہ کرچکا ہوں کہ رام پرساد بسمل کی پیدائش انیسویں صدی کے آخری عشرے میں ۱۸۹۷ میں ہوئی۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں جنگ آزادی کے تعلق سے جو اہم واقعات پیش آئے ان میں رام پرساد بسمل کا کردار ہمیں مختلف شکلوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ رام پرساد بسمل کی زندگی میں آزادی کی چنگاری اس وقت بھڑک اٹھی تھی جب انھوں نے ۱۹۱۵ میں ''بھائی پرمانند'' کے متعلق سنا کہ انگریز حکومت انھیں تختہ دار پر لٹکانے کا فیصلہ کرچکی ہے۔ پھانسی کی یہ خبر ان کے ذہن ودماغ پر بجلی بن کر گری اور اس خبر نے ان کے ذہن ودماغ کو اس طرح متاثر کیا کہ انھوں نے اسی وقت اس بات کا عہد کرلیا کہ جب تک برطانوی سلطنت کو ہندوستان سے باہر نہیں کردیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ میں مختلف نوجوانوں کی شراکت سے انھوں نے ''امریکہ کی آزادی کی تاریخ'' نامی کتاب شائع کی تھی اور مذکورہ کتاب کی اشاعت کا عمل دراصل ان کے بڑے پروجیکٹ کا افتتاحی عمل تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کیا ہوئی کہ انگریز حکومت کے کان کھڑے ہوگئے اور حکومت فوراً حرکت میں آگئی۔ چنانچہ برٹش حکومت نے اس کتاب کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اس پر پابندی عائد کردی اور اس طرح یہ کتاب ضبط کرلی گئی۔

جدوجہد آزادی میں رام پرساد بسمل نے صرف قلم کے سپاہی کا کردار نہیں ادا کیا ہے بلکہ جسمانی طور پر بھی انہوں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کا ثبوت ہمیں مین پوری سازش، چورا چوری کا واقعہ، ہندوستان ریپبلک ایسوسی ایشن، کاکوری سانحہ وغیرہ اس دور کی انگریز مخالف جملہ سرگرمیوں میں ان کے نام کی شمولیت سے ملتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۵ فروری ۱۹۲۲ کو جب گورکھپور میں چورا چوری کا واقعہ رونما ہوا اور احتجاجیوں و پولیس اہلکاروں کے درمیان ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی چنانچہ جب پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور احتجاجیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا تو احتجاجیوں نے بھی مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن کو نذر آتش کردیا۔ اس واقعہ سے گاندھی جی کو بہت صدمہ پہنچا کیونکہ گاندھی جی تشدد کے بالکل بھی حامی نہ تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ آزادی کی یہ جنگ ہم صرف عدم تشدد کے راستے سے ہی جیت سکتے ہیں۔ تشدد کے اس واقعہ نے گاندھی جی کو اس قدر رنجیدہ کردیا کہ انھوں نے اسی وقت یہ من بنالیا کہ عدم تعاون تحریک کو اب ختم کردینا چاہیے چنانچہ ۱۲ فروری ۱۹۲۲ کو عدم تعاون تحریک کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا۔

گاندھی جی کے اس فیصلے سے انقلابیوں کو سخت صدمہ پہنچا اور مختلف لیڈروں نے مثلاً سی، آر، داس، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے گاندھی جی کے اس فیصلے پر سخت تنقید کی حتیٰ کہ جنگ آزادی کی قیادت کے حوالے سے گاندھی جی کے سلسلے میں ان کا اعتماد متزلزل ہوگیا۔ چنانچہ گاندھی مخالف گروپ نے الگ سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے تحت انہوں نے جنوری ۱۹۲۳ کو سوراج پارٹی کی تشکیل کا اعلان کیا اور سی، آر، داس کو اس کا صدر منتخب کیا۔ ان ہی کے طرز پر نوجوانوں نے بھی ایڈہاک پارٹی کے طور پر ''ریولیوشنری پارٹی'' کا اعلان کیا اور ستمبر ۱۹۲۳ میں دہلی میں منعقد کانگریس اجلاس میں ان نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی پارٹی کا نام متعین کرکے سیاست میں حصہ لینا شروع کریں گے۔ اس

طرح HRA (ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن) نامی پارٹی رام پرساد بسمل کی قیادت میں تیار ہوگئی اور ۳/اکتوبر ۱۹۲۴ کو اس پارٹی کی ایک مجلس عاملہ کا اجلاس کانپور شہر میں منعقد ہوا جس میں سچیندر ناتھ سانیال، یوگیش چندر چٹرجی اور رام پرساد بسمل وغیرہ کئی اہم ارکان نے حصہ لیا۔ پارٹی کی تشکیل تو ہوگئی لیکن پارٹی کو چلانے کے لئے انھوں نے آئیرلینڈ کے انقلابیوں کا راستہ اختیار کیا اور پارٹی کی طرف سے منظّم شکل میں ڈاکہ ڈالنے کی کارروائی شروع ہوئی۔ کاکوری سانحہ بھی اسی ڈکیتی کی ایک کڑی تھی جس میں ملوث ہونے کی وجہ سے رام پرساد بسمل کو اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پھانسی کے پھندے پر لٹکنا پڑا۔ کاکوری سانحے کی تفصیل یہ ہے کہ ایچ، آر، اے پارٹی کے لیے فنڈ کی کمی تھی اور بغیر فنڈ کے پارٹی کا کام آگے نہیں بڑھایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ڈکیتی برائے سیاست کا پروگرام بنایا اور دو مقامات پر ڈاکہ زنی بھی کی گئی لیکن ان دونوں ڈکیتیوں میں ایک شخص موقع واردات پر ہی ہلاک ہوگیا۔ کسی بے گناہ کے اس طرح قتل ہوجانے کے واقعہ نے رام پرساد بسمل کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ اب صرف سرکاری خزانے کو نشانہ بنایا جائے گا چنانچہ اپنے اس مشن پر عمل پیرا ہونے کے لئے انھوں نے رخت سفر باندھ لیا اور اگست ۱۹۲۵ کو شاہجہاں پور ریلوے اسٹیشن سے بسمل کی سربراہی میں ۱۰ لوگوں کی جماعت لکھنؤ پسنجر ٹرین میں سوار ہوئی اور لکھنؤ سے پہلے کاکوری اسٹیشن کے بعد گاڑی جیسے ہی تھوڑی آگے بڑھی انقلابیوں نے چین کھینچ کر ٹرین کو روک دیا اور انتہائی سرعت سے گارڈ کے ڈبے میں رکھے ہوئے سرکاری خزانے کے صندوق کو نیچے گرا دیا اور اس طرح انھوں نے بڑی صفائی سے سرکاری خزانے کو لوٹ لیا لیکن جلد بازی میں کسی کی چادر وہاں گرگئی جس کے ذریعہ برطانوی حکومت کے کارندوں نے اس بات کا بڑی آسانی سے انکشاف کرلیا کہ ڈاکہ زنی کی یہ کارروائی انقلابیوں کے ذریعہ مکمل سوچی سمجھی سازش کے تحت کی گئی ہے۔ چنانچہ حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد پولیس کی ٹیم ان کی تلاش میں چھاپے ماری کرنے لگی اور بالآخر چالیس لوگوں کو اس کیس کے تحت گرفتار کیا گیا۔ چونکہ اس سازش میں صرف 10 لوگ ملوث تھے اس لئے ٹرائل کے بعد اکثر کو چھوڑ دیا گیا۔ ملزمین میں سے کچھ کو عمر قید، کسی کو پانچ سال یا دس سال کی سزا سنائی گئی لیکن رام پرساد بسمل اور اشفاق اللہ خان کو پھانسی کی سزا ہوئی اور انھیں ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ کو گورکھپور کی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

رام پرساد بسمل کی شخصیت کا جاذب پہلو یہ ہے کہ وہ انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی صلاحیت کے بھی حامل تھے۔ ان کی علمیت اور تعلیمی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انھیں کاکوری سانحہ میں ملوث ہونے کے جرم میں قید خانہ کی چہار دیواری میں بند کردیا جاتا ہے تو اس فرصت کو وہ اپنے علمی کام میں صرف کرتے ہیں اور اسی قید کی زندگی میں اپنی خودنوشت لکھنے کا کام شروع کردیتے ہیں۔ رام پرساد بسمل کی علمی زندگی کا روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نثر اور شاعری دونوں فن پر عبور رکھتے تھے اسی طرح اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے بنگالی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا اور ان کے نام سے ''من کی لہر'' اور ''کرانتی گیتانجلی'' کے نام سے شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ان کی زندگی پر مبنی مضامین اور کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ رام پرساد بسمل ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے چنانچہ ان کی تحریروں کا دائرہ ہندی زبان تک محدود نہیں تھا بلکہ انھوں نے اردو ادب میں بھی بطور شاعر بڑا مقام حاصل کیا ہے۔ اردو زبان میں ان کی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک کامیاب اور انقلابی شاعر تھے۔ ان کے نام سے موسوم ایک غزل:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بہت مشہور ہوئی لیکن بعض محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ غزل رام پرساد بسمل کی نہیں بلکہ دبستان عظیم آباد سے وابستہ ایک دوسرے شاعر بسمل عظیم آبادی کی ہے لیکن سرکاری ادارے نیشنل آرکائیوز میں یہ غزل رام پرساد بسمل کے نام سے ہی درج ہے بہرکیف یہ صحیح بھی ہے کہ یہ مشہور غزل ان کی نہیں ہے البتہ دیگر غزلیں جن کے بارے میں کسی کو کوئی اشکال نہیں ان کے چند اشعار میں بطور نمونہ یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ رام پرساد بسمل کی شخصیت بطور شاعر کس انداز کی تھی:

ہم بھی آرام اٹھا سکتے تھے گھر پر رہ کر
ہم کو بھی پالا تھا ماں باپ نے دکھ سہہ سہہ کر
وقت رخصت انھیں اتنا بھی نہ آئے کہہ کر
گود میں اشک جو ٹپکیں کبھی رخ پر بہہ کر
طفل ان کو ہی سمجھ لینا جی بہلانے کو

سات بند پر مشتمل مخمس کی شکل میں رام پرساد بسمل کا یہ جو شعری سرمایہ ہے اس میں انھوں نے بہت ہی جذباتی اور احساس سے معمور خیال کا دریا بہا دیا ہے۔ ان اشعار میں بسمل نے ہم وطنوں اور اپنے احباب کو جس انداز میں جدو جہد آزادی کا پیغام دیا ہے اسے سن کر اور پڑھ کر ہر کوئی دیوانہ وار آزادی کی جنگ میں کودنے کو تیار ہو جائے گا اور انگریز حکومت کو اسی بات کا ڈر تھا کہ اگر بسمل کی تحریریں عوام میں پہنچ گئیں تو پھر آزادی کی اس جنگ کو دبانا مشکل ہو جائے گا۔

رام پرساد بسمل کی مزید اور بھی غزلیں ہیں جنھیں ریختہ پر بھی بآسانی دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری غزل کے چند اشعار پیش کر کے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:

چرچا اپنے قتل کا اب دشمنوں کے دل میں ہے
دیکھنا ہے یہ تماشا کون سی منزل میں ہے
قوم پر قربان ہونا سیکھ لو اے ہندیو!
زندگی کا راز مضمر خنجر قاتل میں ہے

Research Scholar,Deptt. of Urdu,
Jamia Millia Islamia, New Delhi
Mobile: 9716422138

سیلولر جیل

عقیلہ شاہین......

بچو! آج ہم اپنے بزرگوں کی قربانی کے صدقے آزادی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے لاکھوں لوگوں نے بلا کسی مذہب وملت کی پرواہ کیے اس جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی قید کی صعوبتیں سہیں، پھانسی کا پھندا چوما، گولیوں سے اپنے سینے چھلنی کروائے، گھر سے بے گھر ہوئے مگر جھکے نہیں۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ ان کا ہر حربہ ناکام ہو گیا ہے اور وہ مجاہدین آزادی کے فولادی ارادوں کو نہیں توڑ پائے تو ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا اعلان کیا تھا۔

آج میں ایک ایسی جیل کا ذکر کر رہا ہوں جو جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہدین آزادی کے لیے کسی متبرک جگہ (تیرتھ) سے کم نہیں تھی۔ یہ انگریزوں کی جیل جس کا نام سیلولر جیل ہے۔ انڈمان نکوبار جزیرہ کی راجدھانی پورٹ بلیئر میں ہے جو آج انگریزوں کے ذریعے مجاہدین آزادی پر کیے گئے ظلم وستم کی چشم دید گواہ ہے اور انگریزوں کی سب سے خطرناک جیل کی شکل میں شمار ہوتی ہے۔ یہ چاروں طرف سے پانی سے گھری ہے۔ چاروں طرف پانی اور سخت پہرہ ہونے کے باعث کسی بھی مجاہد آزادی کے لیے وہاں سے بھاگ نکلنا ناممکن تھا۔

برٹش حکومت میں انگریز نے اس تین منزل سیلولر جیل کو بنانے کا کام ۱۸۶۹ء میں شروع کیا جو ۱۹۰۶ء میں بن کر تیار ہوگئی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں جب جیل بن گئی تو انگریزوں نے مجاہدین آزادی کو اس جیل میں رکھنا درست سمجھا اور اس میں قید کر دیا۔ اس جیل میں ۶۹۴ کوٹھریاں ہیں۔

کئی دفعہ تو مجاہدین اپنے ہی ساتھیوں کے ذریعہ دھوکہ دینے کی وجہ سے اور انگریزوں کے ذریعہ فریب سے گرفتار کر کے قید کر لیے جاتے تھے اور سیلولر جیل میں ان کو عمر قید کی سزا کے لیے بھیج دیا جاتا تھا اسے کالے پانی کی سزا کہا جاتا تھا۔ اس جیل کا نام کالا پانی (Black water) یا بلیک واٹر اس لیے پڑا کیوں کہ اس جیل کے چاروں طرف جو پانی تھا وہ دور تک کالا دکھائی پڑتا تھا۔

اس جیل میں بہت سے مجاہدینِ آزادی، سب ان وطن کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر برتاؤ کیا جاتا تھا، ان کو کئی دنوں تک کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا اور تنگ کوٹھریوں میں کونٹلوں کے حساب سے چکیوں سے اناج پسوایا جاتا تھا، ذرا ذرا سی بات پر ان پر کوڑے برسائے جاتے تھے۔

اُبلی ہوئی ایک طرح کی سبزی یا دال جس میں چکنائی کا نام تک نہیں ہوتا تھا مہینوں تک انھیں کھانی پڑتی تھی۔ روٹیاں ایسے آٹے کی ہوتیں جسے جانور بھی نہیں کھا سکیں۔ انھیں کبھی کبھی تو بنا دال کے روکھی روٹی کھانی پڑتی تھی۔ ان مجاہدین آزادی کے ساتھ جو برتاؤ انگریزوں کے ذریعہ ہوتا تھا وہ انسانیت کی ساری حدیں توڑنے والا ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھی انھیں جیل میں ہی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا جس کے گواہ اس جیل کے کمرے اور ان پر لٹکے پھانسی کے پھندے ہیں۔

۱۷ویں صدی میں مراٹھاؤں نے اس جزیرے سے گزرتے ہوئے برٹش، ڈچ اور پرتگالیوں کے مال سے لدے جہازوں پر حملہ کیا تھا، ۱۷۸۶ء میں انگریزوں نے گورنر جنرل بلیٹ کو بھیج کر پہلی دفعہ اس جزیرے پر قبضہ کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ۱۷۹۴ء میں کسی مجرم کو پہلی بار اس جزیرے پر رکھا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تو انگریزوں نے کئی جزیروں پر قبضہ کر کے انھیں جیلوں کی طرح استعمال کیا۔

۱۹۴۳ء میں نیتا جی سبھاش چندر بوس نے وطن پرستی کا اظہار کرتے ہوئے یہاں ترنگا پھہرایا اور شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

سیلولر جیل اب ایک قومی یادگار میوزیم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس جیل میں شہید ہوئے مجاہدین آزادی کی خوفناک درد بھری داستان کو جو آج بھی رونگٹے کھڑی کر دیتی ہے، دیکھا جاتا ہے، یہاں نمائش لگائی گئی ہے جس

سے اس وقت کے حالات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس جیل میں روز لائٹ اور سائنڈ شو Light and Sound Show بھی ہوتا ہے جس میں ہندی اور انگریزی میں Commentary کی جاتی ہے۔ یہاں ایک آؤٹ گیلری بھی ہے۔

اس جیل میں مولانا فضل حق خیرآبادی، یوگیندر شعلہ، ونائک ساورکر، ناتھ سانیال، بھائی پرمانند، بابا راؤ ساورکر، سوہن سنگھ، ببورائے جیسے مجاہدین آزادی کو قید رکھا گیا تھا۔

بڑی تعداد میں لوگ یہاں روز آتے ہیں اور ان شہید مجاہدین آزادی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور انھیں بڑے احترام سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

35, Seva Sadan Block Complex 12, 1st Floor,
Gali No.1, Mandawali, Delhi-110092
Mob: 8800972360

ٹیپو سلطان

ہندوستان کے پہلے میزائل مین

......فرح انیس

حیدرعلی اور ٹیپو سلطان ہندوستان کے وہ عظیم حکمراں تھے جنھوں نے انگریزوں کو کئی شکستیں دیں۔ ان شکستوں میں ان کے میزائلوں نے اہم رول ادا کیا۔

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ میسور کی فوج نے ۱۷۸۰ سے لے کر ۱۷۹۹ تک کی جنگوں میں دشمنوں کے خلاف میزائل کا استعمال کیا۔ ان میزائلوں نے انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے فوجیوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ دلی سے پائی والوں کا خاندان جن کا تعلق دلی کی مسلمان پنجابی سوداگران برادری سے تھا۔ حیدرعلی کے دور حکومت میں دلی سے ہجرت کر کے میسور چلا گیا تھا۔ یہ لوگ مختلف مشینیں بنانے میں ماہر تھے۔ انھوں نے حیدرعلی اور سلطان ٹیپو کے لیے کئی قسم کی توپیں اور راکٹ (میزائل) تیار کیے۔

آؤٹ لک ویب بیورو کی ۱۸؍فروری ۲۰۱۹ کی رپورٹ کے مطابق کرناٹک کے محکمۂ آثار قدیمہ کو تنگا ندی کے قریب ایک کنویں سے اٹھارہویں صدی میں استعمال ہونے والے بہت سارے راکٹ ملے ہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈسٹرکٹ کمشنر سی۔ جیشور کے مطابق ۲۰۰۲ میں ہمیں ملانڈ علاقے میں راکٹ نما خول ملے تھے اور ہم مزید راکٹوں کی تلاش میں تھے کہ ۲۷؍جولائی ۲۰۱۸ ہوسانہ گرہ تعلقہ سے ۱۰۰۷ راکٹ دریافت ہوئے۔ اسی طرح کے راکٹ برٹش میوزیم اور بنگلور میوزیم میں موجود ہیں، لیکن حالیہ دریافت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ میسور کی فوج نے اٹھارہویں صدی میں ان راکٹوں کو استعمال کیا تھا۔

۱۷۸۰ میں کانچی پورم کے نزدیک انگریزوں کو حیدرعلی کے ہاتھوں زبردست شکست اٹھانی پڑی۔ حیدرعلی اور بعد میں ان کے فرزند ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف اعلیٰ درجے کا آتشی اسلحہ استعمال کیا تھا جس میں یہ راکٹ بھی شامل تھے۔ ۱۷۹۹ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریز کچھ راکٹ اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے تھے۔ جہاں ولیم کونگریو (۱۷۷۲-۱۸۲۸) نے ان کی طرز پر کونگریو راکٹ بنائے۔

کرناٹک کے مغربی گھاٹ جو شموگہ میں واقع ہے کرناٹک کے محکمۂ آثار قدیمہ نے کھدائی کے دوران ایک ہزار راکٹ دریافت کیے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ٹیپو سلطان کے دور حکومت میں بنائے گئے تھے۔ ہندوستان کے ایک سائنس داں روڈم نرسمہا کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان راکٹ ٹیکنالوجی کا بانی ہے جبکہ دوران جنگ ان کا استعمال اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یورپ پہنچا۔

ان راکٹوں کی ہلاکت کا اعتراف کرنل رچرڈ بیلی نے جو چوتھی اینگلو میسور جنگ میں شامل تھا ان الفاظ میں کیا ہے: انھوں نے (ٹیپو سلطان کی فوج نے) ہمارا استقبال ان راکٹوں کی بوچھار سے کیا ہماری صفوں پر موت بن کر نازل ہوئے۔ اپنے ایک مضمون میں ایم افتخار جسیم نے ٹیپو سلطان کے ذریعے استعمال کیے جانے والے ان راکٹوں کے بارے میں کہا ہے کہ تکنیکی اعتبار سے وہ بہترین تھے۔ اسٹیل کے خولوں میں بارود بھرا گیا تھا۔ ان میں جو بارود بھرا گیا وہ بھی الگ قسم کا تھا۔ یہ بھیانک آواز کے ساتھ برستے زوردار دھماکہ ہوتا اور ان میں الگ قسم کا دھواں اور بو نکلتی۔ ان راکٹوں کی لمبائی آٹھ انچ تھی اور ان میں آدھا کلو تک بارود بھرا ہوتا تھا اور یہ ایک کلومیٹر تک مار کر سکتے تھے۔ اس دور میں چین اور یوروپ میں بھی اتنی دوری تک مار کرنے والے میزائلوں کا پتہ نہیں چلتا۔

ایک اور مصنف ڈی ایم فورلیٹ نے اپنی کتاب دی ٹائیگر آف میسور، دی لائف اینڈ ڈیتھ آف ٹیپو سلطان میں لکھا ہے۔ یہ راکٹ گھڑسوار فوج کے لیے تباہ کن تھے۔

ٹیپو سلطان نے اپنی کتاب فتح المجاہدین میں میزائل داغنے والی کو یونٹ فوج کا ضروری حصہ قرار دیا ہے۔

حیدرعلی کی فوج میں میزائل چلانے والوں کی تعداد ۱۲۰۰ تھی جو ٹیپو سلطان کے دور میں پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان کے کچھ راکٹ برٹش میوزیم میں آج بھی محفوظ ہیں۔

2280, Qasimjaan Street, Ballimaran, Delhi-06
M-9810969133

مجاہد آزادی

احمد اللہ شاہ

......ناظمہ پروین

ہماری جنگ آزادی کے متعدد ایسے ہیرو ہیں جنھیں ہم نے بھلا دیا ہے۔ نہ تو انھیں دیگر مجاہدین کی طرح یاد کیا جاتا ہے نہ ان کے نام سے کوئی سڑک یا عمارت تعمیر کی گئی نہ ہی نصابی کتب میں ان کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ مجاہدین شہدا کی صف اول میں کھڑے نظر آتے ہیں لیکن ہماری بدنصیبی کہ نہ تو ہم نے ان کے کارناموں کو جاننے کی کوشش کی اور نہ ہی وطن عزیز ہندوستان کی آزادی کے لیے ان کی تکالیف کا جائزہ لیا۔ ان عظیم مجاہدین اور سپاہیوں میں دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی، جنرل بخت خان، عظیم اللہ خان، نواب مجو خان، مولانا فضل حق خیرآبادی، ڈاکٹر وزیر خان اکبرآبادی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، شہزادہ فیروز شاہ، سردار احمد خاں اور امام بخش صہبائی دہلوی کے علاوہ سیکڑوں ایسے نام ہیں جنھیں جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے بھلا دیا ہے۔

انھیں بھولے بسرے مجاہدین میں ایک عظیم سپہ سالار اور مجاہد مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی بھی تھے، مولانا کو بعض تاریخ دانوں نے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی بھی لکھا ہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کا پورا نام سید احمد علی عرف ضیاء الدین اور خطاب دلاور جنگ تھا۔ وہ جلال الدین عادل کے پوتے اور گولکنڈہ کے حکمراں ابوالحسن تاناشاہ کے پرپوتے تھے۔ ان کے والد شیر میسور ٹیپو سلطان کے درباری تھے۔ انھوں نے ٹیپو کے ساتھ کئی لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھے۔ ٹیپو سلطان کی ۱۷۹۹ میں شہادت کے بعد وہ حیدرآباد کی فوج میں ہو گئے اور اس کے بعد لندن چلے گئے۔ بہادری، جنگی فنون اور وطن پرستی مولانا احمد اللہ شاہ کو ورثہ میں ملی تھی۔

مولانا احمد اللہ شاہ کا شمار جنگ آزادی کے ان عظیم شہدا میں ہوتا ہے جنھوں نے انگریزوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ انھوں نے دو مرتبہ انگریز فوج کو شکست دی اور ایک سال تک انگریزوں کو اودھ کے بیشتر علاقوں میں داخل نہ ہونے دیا۔

مولانا احمد اللہ شاہ حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری نے جب انگریزوں کے بڑھتے مظالم کو دیکھا تو انھوں نے ان کے اقتدار کے خلاف کوششیں شروع کر دیں اور اپنے مریدین سے انگریزوں کے خلاف جان بازی اور سرفروشی کی بیعت لی۔ مولانا احمد اللہ شاہ جذبۂ حریت سے سرشار دہلی آئے یہاں بڑی تعداد میں لوگوں سے بیعت لی اور آگرہ جا کر سکونت اختیار کی۔ مولانا احمد اللہ شاہ اور دیگر علماء نے مل کر مفتی انعام اللہ شہابی کے یہاں مجلس علماء تشکیل دی۔ وہ آگرہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو انگریزوں سے جہاد کے لیے تیار کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے مریدین اور شاگردوں کو اسلحہ چلانے کی تربیت دینی شروع کی۔ امیر علی کی شہادت کے بعد لکھنؤ آگئے اور وہاں سے فیض آباد چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مجلس وعظ میں ایک وقت میں دس پندرہ ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھ کر انگریزوں کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے مولانا کے پیچھے جاسوس لگا دیے۔ مولانا کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان کی گرفتاری کا سن کر ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور عوام نے جیل پر حملہ کر کے مولانا کو آزاد کرا لیا۔ جب بیگم حضرت محل کے فرزند برجیس قدر کو لکھنؤ کے تخت پر بٹھایا اور بیگم حضرت محل نے انگریزوں سے مقابلے کا اعلان کیا تو مولانا احمد اللہ شاہ اپنے ساتھیوں اور مریدوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کے کیمپ میں آگئے اور لکھنؤ کی فوج نے انگریزوں اور ان کے اتحادیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں لیکن حضرت محل کے مشیر خاص ممو خان نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ ایک کینہ پرور انسان تھا۔ نہ تو اسے میدان جنگ کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی آزادئ وطن سے کوئی سروکار اسے صرف اپنا فائدہ اور مفاد عزیز تھا۔ لکھنؤ میں مجاہدین کی شکست کے بعد بیگم صاحبہ شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہو گئیں لیکن مولانا احمد اللہ شاہ لکھنؤ میں ڈٹے رہے اور گوریلا جنگ کر کے انگریزوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔

بریلی میں نواب خان بہادر خان انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے اور ان کے ساتھ پچاس ہزار روہیلہ فوجی جمع ہو گئے تھے۔

نواب خان، بہادر خان نے مولانا احمد اللہ شاہ کو بریلی آکر فوج کی کمان سنبھالنے کی دعوت دی۔ مولانا شاہ جہانپور میں تھے وہاں سے بریلی پہنچے اور انگریزوں اور ان کے اتحادیوں سے زبردست جنگ کی۔ یہاں مغل شہزادہ فیروز شاہ اور جنرل بخت خاں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر مولانا کے ساتھ شریک ہوگئے۔ کئی مقامات پر انگریزوں کو شکست ہوئی اور محمدی کو انگریزوں سے چھیننے کے بعد مولانا احمد اللہ شاہ نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ نانا صاحب دیوان بنائے گئے۔ جنرل بخت خان کو وزیر دفاع اور مولانا سرفراز علی قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ مولوی لیاقت علی، مولوی فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں کو کونسل کا رکن بنایا گیا۔

مولانا احمد اللہ شاہ کے نام کا سکّہ جاری ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ اور مولانا احمد اللہ شاہ میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ فیروز شاہ خود نواب بننے کے سپنے دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی انگریزوں نے ہندوستانیوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھایا اور بعض موقع پرست اور غداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے چھپ کر مجاہدین کی ٹکڑیوں پر حملے کئے جس سے مجاہدین کو کافی نقصان پہنچا۔ مولانا نے پوائن کے راجہ جگناتھ سنگھ سے مدد مانگی۔ وہ غدار انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے دھوکہ دے کر مولانا احمد اللہ شاہ کو پوائن بلالیا۔ مولانا اس غدار پر بھروسہ کرکے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پوائن کے لیے روانہ ہوئے۔ جب وہ پوائن پہنچے تو جگناتھ سنگھ کی گڑھی کا دروازہ بند تھا۔ راجہ جگناتھ سنگھ اپنے بھائی بلدیو سنگھ کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر بندوق لیے ہوئے کھڑا تھا۔ مولانا نے راجہ سے کہا کہ میں آپ کی دعوت پر یہاں آیا ہوں یہ استقبال کا کون سا طریقہ ہے قلعہ کا دروازہ کھولیے، لیکن غدار راجہ نے قلعہ کا دروازہ نہیں کھولا۔ مولانا آگے بڑھے تو راجہ نے اپنے بھائیوں اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر ان کے اوپر گولیاں چلانی شروع کردیں۔ مولانا کے ساتھی اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے نہ ہی وہ جنگ کی تیاری سے آئے تھے۔ وہ تو راجہ جگناتھ سنگھ کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر آئے تھے لیکن اس غدار نے دوستی کا جھانسا دے کر مولانا کی کمر میں چھرا گھونپا۔ مولانا احمد اللہ شاہ ہاتھی سے گر کر شہید ہوگئے۔ ان کا سر کاٹ کر انگریزوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ انگریزوں نے مولانا پر پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر کیا ہوا تھا۔ یہ انعام راجہ جگناتھ سنگھ کو ملا۔ غدار راجہ نے مولانا کو شہید کرکے ان کے جسد کی بے حرمتی کی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے جلا دیا گیا۔ کسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں سے مولانا کا سر حاصل کیا اور مسجد احمد پور محلّہ جہاں آباد میں اس کی تدفین کی گئی۔ مولانا کے بارے میں تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے پہلے بنگال سے پنجاب تک چپاتیاں تقسیم کرا کر انگریز فوج میں شامل ہندوستانی سپاہیوں کو بغاوت کے لیے جو تیار کیا گیا تھا اس میں مولانا احمد اللہ شاہ، عظیم اللہ خان اور نانا صاحب، تاتیا ٹوپے کا ہاتھ تھا۔ مولانا نے بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں دس ہزار اشرفیاں اور پانچ سو سپاہی بھیجے تھے۔ یہ وہ سپاہی تھے جو سر پر کفن باندھ کر دہلی آئے تھے اور انھوں نے آزادی یا شہادت کی قسم کھائی تھی۔ مولانا احمد اللہ شاہ اور جنرل بخت شاہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے وہ عظیم سپاہی تھے جو کبھی چین سے نہیں بیٹھے۔ انھیں جہاں بھی ذرّہ برابر امید نظر آئی کہ جنگ آزادی جیتی جاسکتی ہے تو وہ وہیں پہنچ گئے۔

۱۸۵۷ کی جنگ میں جنرل ٹامس نے شرکت کی تھی اور وہ مولانا کے بارے میں بڑی ایمانداری سے لکھتا ہے:

''مولانا احمد اللہ شاہ بڑی قابلیت کے حامل تھے، وہ ایسے بہادر تھے کہ خوف ان کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ وہ عزم کے پکے اور مستقل مزاج انسان تھے۔ باغیوں میں ان سے بہتر سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر انہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے دو مرتبہ جنرل کالن کیمبل کو میدان جنگ میں شکست دی۔ وہ دیگر باغیوں کی بہ نسبت خطاب 'شاہ' کے زیادہ مستحق تھے۔

اگر محبّ وطن ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑیں تو مولانا احمد اللہ شاہ یقیناً محبّ صادق ہیں۔ انھوں نے کبھی تلوار کو مخفی نہیں رکھا اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا۔ وہ بہادرانہ معززانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوئے جنھوں نے ان کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کے سارے حق گو تعظیم اور ادب کے ساتھ جو شجاعت اور صداقت کے لیے لازمی ہیں اور جن کے مستحق مولوی صاحب تھے ان کو یاد کریں گے۔ (تاریخ شاہ جہاں پور، ص:139)

2793, Pahari Bhojla, Delhi-110006
Mobile: 9560291230
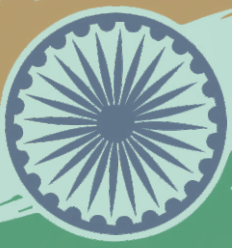
دلی میں آزادی کی نشانی

(سلسلہ وار کہانی 'دلی میں دلی' کی تیسری قسط)

......فرحان بیگ

چھٹی جماعت کے واٹس ایپ گروپ پر فرحان کا پیغام آتا ہے۔

''کیسے ہو دوستو! کووِڈ-19 وبا کی وجہ سے اسکول بند ہیں۔ اس لیے نہ تو ہم ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور نہ ہی کہیں گھومنے جا سکتے ہیں۔امّی کہتی ہیں کہ باہر جانے سے وائرس کے حملے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ماموں جان بھی یہی بتاتے ہیں کہ ایسا کرنا ہماری حفاظت کے لیے ضروری ہے،لیکن میں نے اس مسئلے کا حل نکال لیا ہے۔اِس میسیج کے بعد ایک آڈیو ریکارڈنگ بھیج رہا ہوں۔جس میں ماموں جان ہمیں لال قلعے کے بارے میں کافی دلچسپ باتیں بتا رہے ہیں۔اِسے سُنو اور مزے لو'۔

آدتیہ اور اقبال فوراً آڈیو پلے کرتے ہیں۔سب سے پہلے فرحان کی آواز سنائی دیتی ہے:

''تو ماموں جان بتائیے! آپ ہمیں گھر بیٹھے کہاں کی سیر کرانے والے ہیں''۔ماموں جان کی آواز آتی ہے۔''میں آج تم کو دلّی میں آزادی کی نشانی یعنی 'لال قلعہ' کی سیر کراؤں گا''۔فرحان چہکتی ہوئی آواز میں کہتا ہے''واہ!لال قلعہ!مزہ آجائے گا''۔

ماموں جان: بالکل۔تو سنو!لال قلعہ لال پتھر سے بنا ہوا ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔یہ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنے رہنے کے لیے جمنا کے کنارے پر تعمیر کرایا تھا۔چاندنی چوک بازار سے یہ قلعہ صاف اور دل کش نظر آتا ہے۔فرحان کی آواز سوالیہ لہجے میں سنائی دیتی ہے ''چاندنی چوک بازار''؟

جی بیٹا! یہ پرانی دہلی میں واقع ہے۔لال قلعہ آج سے تقریباً پونے چار سو سال پہلے ۱۶۴۸ میں بنوایا گیا تھا۔ماموں جان نے جواب دیا۔

فرحان کی چھوٹی بہن عائشہ کی آواز آتی ہے''بھائی!پونے چار سو کتنے ہوتے ہیں؟فرحان نے بتایا''تھری ہنڈریڈ اینڈ سیونٹی فائیو''۔

فرحان: ماموں جان: اتنے بڑے قلعے میں شاہ جہاں بادشاہ اکیلے رہتے تھے؟

ماموں جان: (ہنستی ہوئی آواز میں) نہیں۔بادشاہ کے ساتھ ان کا پورا خاندان اور دیگر ملازمین بھی اس قلعے میں رہا کرتے تھے۔یہ بہت بڑا اور مضبوط قلعہ ہے۔اس کے چاروں طرف حفاظت کے لیے خندق بنی ہوئی تھی۔فرحان پوچھتا ہے''خندق کیا؟'' ماموں جان بتاتے ہیں کہ خندق چھوٹی سی کھائی کو کہتے ہیں۔جو دشمنوں سے حفاظت کے لیے کھودی جاتی ہے۔قلعے کے چاروں طرف بنائی گئی اس خندق میں پانی بھرا رہتا تھا تاکہ کوئی شخص آسانی سے قلعے تک نہ پہنچ سکے۔اس قلعے کے اندر بہت خوب صورت اور بڑے محل بنے ہوئے تھے۔بادشاہ کی مسند یعنی کرسی کا نام 'تختِ طاؤس' تھا۔یہ تخت سونے چاندی سے بنا ہوا تھا۔جس میں قیمتی ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔قلعے میں بہت خوب صورت نہریں، فوّارے اور باغات بھی تھے۔عائشہ ماموں جان سے پوچھتی ہے کہ یہ سب کچھ اس قلعے میں اب بھی ہے؟

ماموں جان: بیٹی! اب لال قلعہ پہلے جیسا نہیں رہا،لیکن اِن سب چیزوں کی نشانیاں باقی ہیں۔عائشہ فوراً پوچھتی ہے''تو ماموں جان ہمیں لے چلیے نا!لال قلعہ دِکھانے''۔ماموں جان نے پیار سے جواب دیا کہ ضرور۔۔حالات جیسے ہی خوش گوار ہوں گے،ہم ضرور چلیں گے۔فرحان کی آواز آتی ہے''ماموں جان نشانی سے یاد آیا،آپ نے کہا تھا کہ لال قلعہ آزادی کی نشانی ہے''۔

''ہاں بیٹا!لال قلعہ ہندوستان کی آزادی کی نشانی ہے''۔ماموں جان نے کہا۔تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک برسوں تک انگریزوں کے قبضے میں رہا۔اب سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے انہوں نے مغلوں کو شکست دی

اور ۱۸۵۷ میں ہمارے ملک پر پوری طرح حکومت کرنے لگے۔ عائشہ نے پھر فرحان سے پوچھا ''بھائی پونے دوسو کتنے ہوتے ہیں؟'' فرحان کی محبت بھری آواز آتی ہے ''وَن ہنڈریڈ اینڈ سیونٹی فائیو''۔

ماموں جان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جس طرح لال قلعہ بادشاہوں کے رہنے کی جگہ اور اُن کا دفتر تھا، اُسی طرح انگریزوں نے بھی اِسے اپنا دفتر بنایا اور جیت کی نشانی کے طور پر اس کو استعمال کیا۔ انہوں نے قلعے کے لاہوری دروازے پر اپنا جھنڈا لہرایا۔

فرحان: تو پھر لال قلعہ آزادی کی نشانی کیسے ہوا؟

ماموں جان نے فخریہ انداز میں کہا کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی۔ اس کے لیے ملک بھر میں جدّ وجہد ہوئی۔ انگریزوں کے خلاف ہمارے بڑوں نے بہت قربانیاں دیں۔ اِن میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، سردار وِلّبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، شہید بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس جیسے کئی لوگ شامل تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے ظلم اور مصیبتیں برداشت کیں۔ ماموں جان کی آواز سے ایک جوش محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے'' آخر کار انگریزوں کو ہندوستانیوں کے سامنے ہار ماننی پڑی۔ انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ 15 اگست 1947 کو ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ انگریزوں کی طرح ہمارے بڑوں نے بھی لال قلعے کو ہی اپنی جیت اور آزادی کی علامت بنایا اور اس کے لاہوری دروازے پر ہندوستان کا قومی جھنڈا لہرایا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے آزادی کے بعد اس دروازے سے پورے ملک کو خطاب کیا۔ تب سے ہر سال آج تک یوم آزادی یعنی 15 اگست کو ہندوستان کے وزیر اعظم اس دروازے پر قومی جھنڈا لہراتے ہیں اور ملک کو خطاب کرتے ہیں''۔

فرحان جوش میں بولا ''یعنی اس سال بھی وزیر اعظم وہاں تقریر کریں گے''۔ ماموں جان نے کہا ''ہاں بیٹا! اور اسی مہینے کریں گے۔ اگست کا مہینہ جاری ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہمارا ملک اس مہینے 75واں یومِ آزادی منائے گا۔ اس لیے دلی کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں سال بھر جشن منائے جائیں گے''۔

''میں اس بار ضرور وزیر اعظم کی تقریر سُنوں گا۔'' فرحان کی پُر جوش آواز سنائی دی۔ ماموں جان نے کہا ''ہاں۔ ہم سب ایک ساتھ سنیں گے''۔ آڈیو ریکارڈنگ مکمل ہو جاتی ہے۔

آدتیہ کلاس کے واٹس ایپ گروپ پر کمینٹ کرتا ہے'' واہ مزہ آ گیا۔ ہم لال قلعہ ضرور دیکھنے جائیں گے''۔

اقبال کمینٹ کرتا ہے۔ ''بہت اچھی معلومات حاصل ہوئیں۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ آخر وزیر اعظم لال قلعے پر ہی تقریر کیوں کرتے ہیں؟''

اتنے میں کلاس ٹیچر یاسمین میڈم کا میسیج آیا ''فرحان! آپ کے ماموں صاحب نے بہت اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ میں سبھی طلبا سے کہتی ہوں کہ اس آڈیو کو ضرور سنیں اور کم از کم پانچ لائنیں آزادی کے بارے میں لکھ کر اسی گروپ میں چیک کرائیں۔ میں پرنسپل صاحب سے گزارش کروں گی کہ اسکول شروع ہونے کے بعد فرحان کے ماموں صاحب کو اسکول میں لکچر دینے کی دعوت دیں۔''

اس کے بعد دیگر طلبا کے پیغامات میں، ٹھیک ہے میم، اوکے میم وغیرہ کے ساتھ ساتھ لال قلعہ دیکھنے کی خواہشات بھی تھیں۔

3968, Gali Khankhana, Urdu Bazar,
Jama Masjid, Delhi-110006
Mob: 98918 28258

ارونا آصف علی

ہندوستان کی جاں باز بیٹی

......بشریٰ وقار

کل اپنے کنبے کے ساتھ دلی میں حوض خاص سے گزر رہا تھا۔ جب ہمارے کارواں نے آصف علی روڈ کو پار کیا تبھی میرے بھتیجے نے بورڈ دیکھتے ہوئے پوچھا کہ ''چاچو یہ ارونا آصف علی کون ہیں؟'' میں نے اطلاعاً عرض کیا کہ وہ ایک بہت اہم مجاہدِ آزادی تھیں، لیکن پھر میرے بھتیجے نے مزید سوال کیا تو میں خاموش ہو گیا اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ میں خود تحقیق کروں گا اور آپ کے ساتھ اپنی تحقیق کے نتائج بانٹوں گا، پھر خیال آیا کہ میں وہ ساری باتیں اپنے ننھے ساتھیوں کے ساتھ بھی بانٹوں۔

ارونا آصف علی ایک پیشہ ور ''ماہرِ تعلیم'' (Educationist) تھیں جن کی پیدائش ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ کو صوبۂ پنجاب کے شہر کالکا (اب ہریانہ) میں ہوئی تھی، ایک بنگالی برہمن گھرانے میں پیدا ہونے والی ارونا کا پیدائشی نام ارونا گانگولی تھا۔ ارونا صاحبہ کے والد کا نام اُپیندر ناتھ گانگولی اور والدہ کا نام امبالیکا دیوی تھا۔ ارونا صاحبہ کی ابتدائی تعلیم لاہور کے سیکنڈر ہارٹ کانوینٹ میں ہوئی تھی جبکہ کالج کی تعلیم انھوں نے آل سینٹس کالج، نینی تال سے حاصل کی تھی۔ تعلیم مکمل کر کے ارونا صاحبہ نے اپنی پیشہ ور زندگی کا آغاز کلکتہ میں کیا تھا جہاں انھوں نے گوکھلے میموریل اسکول میں استاد کے طور پر ملازمت اختیار کی تھی۔

حب الوطنی کا جذبہ ارونا صاحبہ کے دل میں ان کے بچپن سے ہی پنپ رہا تھا اور حکومتِ برطانیہ کے ہاتھوں تھوپی گئی غلامی سے ہمیشہ سے پرہیز رہا تھا۔ اسی دوران ان کی ملاقات آصف علی صاحب سے ہوئی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی تنظیم ہندوستانی کانگریس کے کارکن تھے اور بھگت سنگھ کی طرف داری کرنے کے لیے پہلے ہی کافی مشہور ہو چکے تھے۔ ارونا صاحبہ آصف علی صاحب کی شخصیت اور خیالات سے بے انتہا متاثر ہوئیں اور ان سے شادی کرنے کا فیصلہ لیا، جبکہ آصف علی صاحب عمر میں ان سے ۲۳ سال بڑے تھے۔ حالانکہ ارونا صاحبہ کے ہندو اور آصف علی صاحب کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس شادی میں کئی مسائل آئے اور ان دونوں کو کئی رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن ان دونوں شخصیتوں کا عہد اور قربت اس قدر مضبوط تھی کہ انھوں نے تمام مسئلوں کو اپنی ہمت سے شکست دی اور آخرکار یہ دونوں مجاہدین آزادی سنہ ۱۹۲۸ میں شادی کے پاک رشتے کے ذریعہ ایک ہوئے۔ یہ شادی آنے والے وقتوں میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک بے حد عمدہ مثال بنی۔ اپنی شادی کے بعد ارونا نے اپنے شوہر کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑنے کا فیصلہ لیا اور اپنا نام تبدیل کر کے ارونا آصف علی کر لیا، آج تک وہ اسی نام سے جانی جاتی ہیں۔ اس نام کے ساتھ ارونا صاحبہ اور آصف علی صاحب کا ایک دوسرے پر اعتماد ان دونوں کے انتقال کے اتنے سال بعد بھی زندہ ہے۔

آصف علی صاحب سے شادی کے بعد ارونا صاحبہ کانگریس کے کاموں میں اور زیادہ فعال طور پر شرکت کرنے لگیں، پورے زور و شور سے وہ کانگریس کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتیں اور تمام اہم فیصلوں میں ان کی شرکت ہوتی۔

ارونا صاحبہ کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی آئی۔ سنہ ۱۹۳۱ میں جب گاندھی جی کی رہنمائی میں تمام ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ کا اعلان ہوا اور احتجاج شروع ہوئے۔ ارونا صاحبہ اس تحریک میں ایک قومی رہنما کی طرح ابھریں اور انھوں نے کئی احتجاجات اور ریلیوں کی رہنمائی کی، اس رہنمائی کی وجہ سے ارونا صاحبہ برطانوی ناظموں کی نظر میں گڑنے لگیں اور آخرکار سنہ ۱۹۳۱ میں ہی ان کو آوارگی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب گاندھی ارون قرار کے بعد تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا تب بھی ارونا صاحبہ کی رہائی نہیں ہوئی، ان کی رہائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تمام ساتھی زنانہ قیدیوں نے رہائی سے انکار کر دیا اور ارونا کی رہائی کے لیے جیل میں ہی

احتجاج شروع کر دیا، اس احتجاج کا اثر یوں ہوا کہ برطانوی ناظموں کو ارونا آصف علی صاحبہ کو بھی باقی سیاسی قیدیوں کی طرح رہا کرنا پڑا اور وہ بھی جیل سے آزاد ہو گئیں۔

نمک ستیہ گرہ کرنے اور یوں جیل جانے کی وجہ سے ارونا صاحبہ نے اپنا نام ایک اہم مجاہدِ آزادی کے طور پر درج کرا لیا تھا اور اب تمام ہندوستانی عوام انھیں ایک باعزت رہنما کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ ارونا صاحبہ بھی دائمی طور پر ہندوستان کی آزادی کے لیے چل رہی مہموں کے ساتھ تمام جوش وخروش کے ساتھ جڑتی رہیں۔ ان تمام مہموں میں شرکت کرنے کی وجہ سے انھیں سنہ ۱۹۳۲ میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس قید کے دوران انھوں نے قیدیوں کے ساتھ کیے جا رہے غیر انسانی اور غیر مناسب رویوں کے خلاف بھی احتجاج کیا۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں دلی کی تہاڑ جیل سے انبالہ جیل بھیج دیا گیا اور تنہائی کی قید میں رکھا گیا۔ اس بار رہائی کے بعد وہ دس سال تک سیاسی طور پر خاموش رہیں اور دس سال بعد ۱۹۴۲ میں بھارت چھوڑو تحریک (Quit India Movement) کے دوران پرزور طریقے سے منظرِ سیاست پر دوبارہ ابھریں۔ ان کا سب سے بڑا اقدم اسی بھارت چھوڑو تحریک کے ابتدائی دنوں میں نظر آیا جب انھوں نے اس تحریک کی شروعات ممبئی کی گولیا ٹینک میدان (اب کا آزاد میدان) میں ہندوستانی ترنگا پھہرایا، یہ منظر بھارت چھوڑو تحریک اور جنگِ آزادی کے دور کے سب سے اہم اور یادگار نقش میں سے ایک ہے۔

بھارت چھوڑو تحریک میں شرکت کے باعث برطانوی حکومت نے گرفتار کرنے کے لیے ان کی تلاش شروع کی لیکن تب تک ارونا صاحبہ چھپ گئی تھیں۔ انگریزوں نے ان کو نہ تلاش کر پانے کی صورت میں ان کے نام پر درج تمام چیزوں پر قبضہ کر کے ان کی نیلامی کر دی، لیکن ان تمام اقدامات سے بھی ان کے حوصلوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور چھپے ہوئے ہونے کے باوجود وہ تمام تحریکوں کا حصہ بنی رہیں، یہاں تک کہ اسی دوران وہ رام منوہر لوہیا صاحب کے ساتھ مل کر کانگریس کے ماہنامہ انقلاب کی بھی سرپرستی کرتی رہیں۔ ان کی ہمت کی انتہا یہ تھی کہ جب ۱۹۴۶ میں گاندھی نے ان کو خود کو پولیس کے حوالے کرنے کی صلاح دی تب بھی انھوں نے یہ رائے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ میں ہی ان کے خلاف جاری کیا گیا وارنٹ حکومتِ برطانیہ نے واپس لے لیا اور تب وہ عام منظر پر پھر نکل آئیں۔

۱۹۴۷ میں آخر کار ہندوستان آزاد ہوا اور ۱۹۴۸ میں ارونا صاحبہ نے کانگریس پارٹی چھوڑ کر سوشلسٹ پارٹی کا دامن تھاما اور ۱۹۵۰ کی دہائی کی شروعات میں انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کا حصہ بننے کا فیصلہ لیا، جس کو انھوں نے ۱۹۵۶ میں چھوڑ دیا، حالانکہ پھر وہ تمام عمر بائیں بازو خیالات سے متاثر رہیں، ۱۹۶۴ میں وہ دوبارہ کانگریس میں آئیں لیکن پھر کبھی دنیائے سیاست میں بہت آگے نہ رہیں۔

ارونا آصف علی تمام عمر کمزور قوموں کے مسائل پر بولتی رہیں اور ان کی جنگ لڑتی رہیں۔ وہ دائمی طور پر پچھڑے طبقوں جیسے دلت، آدی واسی اور عورتوں کے مسائل پر ہر جگہ اپنی آواز بلند کرتی رہیں۔ سنہ ۱۹۵۸ میں وہ دلی کی پہلی چنی ہوئی میئر بھی بنیں۔ جنگِ آزادی کے دوران ان کی اہم رہنمائی اور شرکت کرنے کی وجہ سے انھیں عظیم بزرگ خاتون (Grand Old Lady) اور ۱۹۴۲ کی ہیروئنِ (Heroine of 1942) جیسے لقب سے بھی نوازا گیا۔ ملک کی یہ جانباز بیٹی سنہ ۱۹۹۶ میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئی۔

انھیں ان کے انتقال کے بعد سنہ ۱۹۹۷ میں ہندوستان کے سب سے بڑے عوامی اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ارونا آصف علی صاحبہ کو کئی ملکی اور غیر ملکی اعزاز دیے گئے۔ ۱۹۶۵ میں انھیں لینن پیس پرائز سے نوازا گیا، سنہ ۱۹۹۲ میں انھیں حکومت ہند نے پدم وبھوشن سے نوازا اور ان کی حیات میں بین الاقوامی سمجھ داری کے لیے نہرو اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔

آج ہم اپنی بزرگ اور ہندوستان سے محبت رکھنے والی ان عظیم مجاہدِ آزادی اور ایک حساس سیاست داں کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ننھے ساتھیو! آپ سب بھی ہمارے ساتھ عہد کیجیے کہ ارونا آصف علی صاحبہ نے جو راستہ ہمیں دکھایا ہے، ہم اس پر تاعمر چلتے رہیں گے۔

T-81, 2nd Floor, Gali No. 7, Zakir Nagar,
Jamia Nagar, Okhla (Near Islah Masjid),
New Delhi - 110 025
Mob: 9643114026

آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کا کردار

......سیدہ نوشاد بیگم

بچو! آپ کے لئے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بھی قدم سے قدم ملا کر اور شانہ بہ شانہ دیگر قوم کے نوجوانوں کے ساتھ مِل کر کارگزاری انجام دی۔ ایثار کیا۔قربانیاں دیں اور بیشتر تو اسی جنگِ آزادی کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تاریخ کے صفحات ایسے جیالے نوجوانوں کی کارکردگیوں سے بھرے پڑے ہیں، جنھوں نے محبِّ وطن ہونے کا ثبوت دیا اور آخر کار مادرِ وطن پر ہنستے ہنستے جانوں کی بازی لگا دی۔

جب بھی وطن کی آزادی کا ذکر آئے تو ہمارا سر شرم سے کبھی جھکنے نہ پائے۔ کیونکہ ہم نے بھی وطن کی آزادی میں اُتنا ہی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے جتنا کہ دیگر قوم کے لوگوں نے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو برٹش سرکار کے خلاف سب سے پہلا نعرہ سراج الدولہ کا تھا۔ بنگال کا نواب سراج الدولہ تھا اور اُنھوں نے برٹس حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی تھی لیکن جنگِ پلاسی میں انھیں دھوکے سے مار دیا گیا۔صرف ۲۴ سال کی نوجوانی کی عمر میں وہ چل بسے۔قاضی عبدالرحیم کی والدہ وہ بہادر خاتون تھیں اصغری بیگم جنھوں نے بھی جب انگریز حکومت کے خلاف آواز اُٹھائی تو انھیں انگریزوں نے زندہ جلا دیا۔یہ ایک دلدوز داستان ہے۔

مولوی احمد اللہ شاہ نے برٹش حکومت کو بہت ہراساں کیا۔اُن کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ وہ وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلے اور اودھ کی بیگم حضرت محل کے ساتھ مِل کر تعاون کیا۔ اُن کا دبدبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ انگریزوں کے لئے یہ قابلِ قبول نہ تھا اور لارڈ کینگ نے اُن کے سر کی قیمت ۵۰ ہزار لگائی اور انھیں فریب کا شکار کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

اُسی زمانے میں سپاہیوں کی بغاوت کو بھی دبا دیا گیا۔ پھر ہندوستان کی تاریخ میں کانگریس کا سجھاؤ رکھا گیا اور ایک گروپ کانگریس پارٹی کے نام سے آزادی کے لئے کام کرنے لگا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں مولانا مظہر الحق بہار کانگریس کے وائس چیئر مین مقرر ہوئے۔ آزادی کی جنگ میں انھوں نے تحریک عدم تعاون کی یا تحریک خلافت ، چمپارن ستیہ گرہ، یہ تمام مُہم چلا کر آزادی کی جنگ میں اشتراک کرتے رہے۔ ہندوستان میں آزادی کی جنگ جوں جوں رفتار پکڑتی گئی لوگ آتے گئے اور اُس آزادی کی جنگ کا حصّہ بنتے گئے۔گاندھی جی، نیتا جی سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ کے ساتھ ابوالکلام آزاد، ذاکر حُسین، خان عبدالغفار خان، گاندھی جی کے اہنسا کے اُصولوں کو مضبوط بنا کر اُس کو ملک میں عام کرتے رہے کہ خون خرابہ اور دہشت گردی کے بغیر بھی ہم انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں۔اُنھوں نے اہنسا پر اعتماد رکھ کر آزادی کی لڑائی کو آگے بڑھانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

دوسری جانب اشفاق اللہ خان نے کاکوری بینک کو لُوٹنے کا منصوبہ بنایا کیونکہ آزادی کی جنگ میں جتنے بھی بہادر شریک ہو رہے تھے اُن کو کھانے پینے اور رہنے کا سامان مہیّا کرنا تھا اور پیسوں کی قلت تھی۔اس لئے کاکوری بینک لوٹا گیا۔محمد علی برادران نے ان سب سے ہٹ کر انگریزی حکومت کے مال کا بائیکاٹ کیا۔تمام اقوام کے افراد نے مِل جُل کر آزادی کی جنگ میں تعاون کیا۔انگریزوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب زیادہ دن ہم یہاں ٹِک نہیں سکتے اور راج نہیں کر سکتے۔اس لئے دو قوموں کے درمیان نا اتفاقی پیدا کرنی شروع کی۔آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو، ہندوستان میں ذات پات کے بھید بھاؤ کو اُکسایا۔آپسی تفریق کو بڑھاوا دیا۔بٹوارے کی بہت سے مسلم رہنما مخالفت کرتے رہے۔بہت سے انقلابی لیڈروں نے حصّہ بھی لیا، لیکن اُن کی سُننے والا کوئی نہیں تھا۔سیف اللہ قادری نے گاندھی جی کا ساتھ دیا۔جب ڈاکٹر راجندر پرساد بیمار ہوئے تو اُنھوں نے علاج کیا۔۲۰۰۷ء میں پدم بھوشن کا ایوارڈ دے کر نوازا گیا۔اُن کا انتقال ۱۰۴ سال کی عُمر میں ہوا۔

آصف علی وکیل تھے۔وہ تجارت کے انقلابیوں کو عدالت میں انصاف دلانے کا اُمور انجام دیتے تھے۔آزادی کے بعد وہ اُڑیسہ کے گورنر بنے۔ڈاکٹر ذاکر حُسین آزاد بھارت کے تیسرے صدر جمہوریہ تھے۔وہ بھی اہنسا کے پکّے حمایتی تھے۔

بچو! اس جنگِ آزادی میں مُسلم ہیروز کا بھی بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا۔

Shree Darshan Apartment, 203, Mumbai Pune Road, Shastri Nagar, Kalawa-400603 Distt. Thane (Maharashtra)
M-9867650210

لائٹ کیمرا ایکشن

سَو دیس: ذہنی تحفظ کی ایک عظیم داستان

......وامق ضیا

ایک روایت رہی ہے کہ ۱۵ اگست کے دن حب الوطنی کے خیال سے جڑی ہوئی فلمیں دوردرشن پر دکھائی جاتی ہیں، مجھے یاد ہے کہ اپنے بچپن میں ۱۵ اگست کے دن میں اپنا ہوم ورک اور باقی پڑھائی جلدی کرلیا کرتا تھا تاکہ آرام سے یہ فلم دیکھ سکوں۔ میرے پیارے ساتھیو! اس دور میں میں نے ایک فلم دیکھی تھی جو آج دوبارہ دیکھی تو خیال آیا کہ یہ اگست مہینہ ہے، اور ۷۴ سال پہلے اسی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو ہندوستان تقریباً ۲۰۰ سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس فلم کا نام آپ سب نے یقیناً سنا ہوگا، یہ فلم ہے ''سَو دیس'' اور اس فلم کو دیکھ کر سامعین کے دل میں وطن کی محبت اجاگر ہو جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ فلم ایک سچے واقعہ پر بنی ہے، مہاراشٹر کا ایک شادی شدہ جوڑا اپنی اچھی نوکری چھوڑ کر ہندوستان کی خدمت کے لیے لوٹا تھا، وہیں سے اس فلم کا خیال ابھرتا ہے۔

یہ فلم سنہ ۲۰۰۴ میں پردے پر جلوہ افروز (Release) ہوئی تھی، اس کے ہدایت کار اور مصنف تھے آشوتوش گوواریکر اور اس میں مرکزی کردار آپ سب کے پسندیدہ اداکار شاہ رخ خان اور گایتری جوشی نے ادا کیے تھے۔

سَو دیس فلم کا بنیادی خیال ہندوستان کے ذہنی رساؤ (Brain Drain) کے دائمی مسئلے پر منحصر ہے۔ ذہنی رساؤ (Brain Drain) سے مراد ہے کہ ذہانت کا رساؤ یا یوں کہا جائے کہ علم و مہارت کا ضرورت کی جگہ سے باہر کہیں اور لگ جانا، ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس تعلیم کا استعمال غیر ملکوں میں نوکریاں حاصل کر کے ان کی ترقی کے لیے کرنے کی روایت سے ذہنی رساؤ (Brain Drain) کے مسئلے کا تعلق ہے۔ یہ فلم ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے امریکہ کی ایک بہت عظیم تنظیم (Nantional Aeronautics and Sapace Administration) میں ملازمت اختیار کرتا ہے اور وہاں ایک اونچا عہدہ حاصل کرتا ہے، اس شخص کا نام ہے ''موہن بھارگو''، ان تمام کامیابیوں کے باوجود اسے پردیس میں ایک اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے، اس تنہائی کا احساس اسے اپنے ملک لے آتا ہے، جہاں وہ اپنی دائی سے ملنا چاہتا ہے، یہ وہ دائی ہیں جنھوں نے اسے پیدا تو نہیں کیا لیکن اس کی پرورش انہی دائی نے کی تھی، یہ دائی ماں کا کردار اس فلم میں ملک کے استعارے (Metaphor) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ خیر یہ شخص

موہن جب ہندوستان لوٹتا ہے تو اسے خبر ملتی ہے کہ اس کی یہ دائی ماں اپنے گاؤں میں مقیم ہیں، انھیں ڈھونڈتا ہوا اور اپنی راہ تلاش کرتا ہوا موہن بھارگو اپنی دائی ماں کو آخر کار ڈھونڈ لیتا ہے اور ان کے ساتھ ان کے گاؤں میں ہی اپنی چھٹیاں بسر کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

گاؤں میں اپنی دائی ماں کے ہی گھر پر موہن کی ملاقات ہوتی ہے گیتا سے، جو ایک بڑے شہر میں تعلیم حاصل کر کے اپنے گاؤں کے ہی اسکول میں پڑھانے کا کام کرتی ہے۔ گاؤں میں وقت بسر کرنے کے دوران اپنی دائی ماں، گیتا اور باقی کرداروں کے ذریعہ موہن کو اپنے ملک کے مسائل کا احساس ہوتا ہے، حق تلفی اور ناانصافیوں سے روبرو ہوتا، اپنی نظروں سے تعلیم کی کمی اور اس سے پیدا ہونے والی خامیوں کو بہت قریب سے دیکھتا ہے، غربت سے پیدا ہونے والی لاچاری کو دیکھتا ہے، بے روزگاری کی کمی کو اور سب سے زیادہ تعجب ہوتا ہے اسے بجلی، پانی جیسی بنیادی ضرورتوں کی کمی سے، وہ اس سفر پر اس ہندوستان کو دیکھتا ہے جو شہر میں رہتے ہوئے اس کی نظروں اور زندگی سے بہت دور تھا۔

موہن کو یہ سارے مسئلے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ فلم میں ایک جگہ جب سارے کردار کہتے ہیں کہ ہندوستان دنیا کا سب سے عظیم ملک ہے تب موہن اس خیال سے نااتفاقی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہندوستان میں قوت ہے کہ وہ دنیا کا سب سے عظیم ملک بن سکے بشرطیکہ یہاں کے لوگ ایک جٹ ہو کر اور بنا کسی تعصب کے تمام مسائل کا حل نکال سکیں۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے وہ تمام فرقوں کے لوگوں کو ایک جٹ کر کے اپنے گاؤں کی بجلی کا مسئلہ حل کرتا ہے، جس سے کہ وہ گاؤں کی بجلی کے معاملے میں خود کفیل (Self Dependent) ہو جاتا ہے۔

ان تمام کاموں کے دوران اسے گاؤں والوں کے اور قریب آنے کا اور انھیں بہتر طریقے سے جاننے کا موقع ملتا ہے۔ امریکہ لوٹنے کے بعد اسے ان تمام مسائل کا خیال رہ رہ کر آتا ہے اور گاؤں کے ہی ایک شخص کی بات خاص طور پر اس کے ذہن میں گھومتی ہے کہ غیر ملک میں اپنی مہارت کا استعمال کرنا ویسا ہی ہے جیسے کہ اپنے آنگن کا دیا پڑوسی کے گھر کو روشن کرے اور اپنے گھر میں اندھیرا ہی رہ جائے۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے موہن کو پردیس میں احساس ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت اس کے ملک کو پردیس سے زیادہ ہے اور بہتر ہوگا اگر وہ اپنے تجربہ اور ذہانت کا استعمال غیر ملک کی ترقی کے بجائے پہلے اپنے ملک کی ترقی کے لیے کرے پھر اوروں کا خیال کرے، انہی سب خیالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ امریکہ کی نوکری سے استعفیٰ دے کر ہندوستان کی ترقی کے لیے اپنے گاؤں لوٹ آتا ہے۔

سَودیس، جس فلم کا ذکر ہم اس مہینے کے شروع (edition) میں کر رہے ہیں، وہ ایک بے انتہا حساس اور خوبصورت تحریر تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ہی یہ فلم ہمیں کئی اہم سبق بھی سکھاتی ہے جیسے:

1۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہمارا علم اور ذہانت سب سے پہلے ہمارے ملک کے کام آئے اور اپنے ملک کی ترقی کے لیے ہم اپنی تمام خوبیوں کا استعمال کریں۔ اس کے بعد ہم اوروں کے بارے میں سوچیں۔

2۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "ہندوستان کا مستقبل اس کے گاؤں میں بستا ہے"، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو اپنے گاؤں میں بستا ہے

اوراس کی ترقی اس کے گاؤں کی ترقی سے جڑی ہوئی ہے، اس لیے تمام کوششیں کر کے ہمیں اپنے گاؤں کو ترقی یافتہ بنانے کی جانب رجوع ہونا چاہیے۔

3۔ ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت یہاں بسنے والے مختلف فرقوں کے لوگ ہیں اور ملک میں خوش حالی تبھی ممکن ہے جب تمام فرقوں کے لوگ اپنے بیچ کے فرق کو مٹا کر اتحاد کے ساتھ رہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کام کریں۔ اس فلم میں ہدایت کار نے یہ بات ''یہ تارا وہ تارا'' گانے کے ذریعہ واضح کی ہے۔

4۔ بزرگ کسی بھی ملک کی جڑ ہوتے ہیں، جوان ملک کی شاخیں ہیں اور بچے پھل اور پھول ہیں، کوئی بھی ملک تبھی تک سبز ہے جب تک اس کی جڑیں، شاخیں اور پھل پھول اپنا اپنا کام پوری ذمہ داری، امانتداری اور لگن سے کرتے رہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی بڑی باتیں ہیں جو یہ فلم سکھاتی ہے، تو آپ جب بھی اگلی دفعہ یہ فلم دیکھیں تو ان پر غور کریں۔

ننھے ساتھیو! آیئے اب آپ کو اس فلم سے جڑی کچھ اور دلچسپ باتیں بتاتے ہیں، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پہلی بار اصل NASA کی زمین پر اسی فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی، NASA تمام بیرونی خلاء پر تحقیق کرنے والی دنیا کی سب سے اعلیٰ تنظیم ہے۔ اس فلم کو بنانے کا خیال سب سے پہلے اس کے ہدایت کار آشوتوش گووار یکر کو رجنی بخشی کی لکھی کتاب باپو کٹی پڑھتے ہوئے آیا تھا، اس فلم میں موہن بھارگو کا کردار مہاراشٹر کے رویکو چماپچی اور اروندا نام کے میاں بیوی پر ہے۔

اب آخر میں میں آپ سے یہی کہوں گا کہ جب بھی آپ کو وقت ملے تو یہ فلم سَودیس اپنے بڑوں اور ساتھیوں کے ساتھ ضرور دیکھیں۔ آپ لوگوں نے شاید انہی ہدایت کار گووار یکر کی فلم لگان ضرور دیکھی ہوگی اور ہاں جاتے جاتے میں آپ کو چند اور فلموں کے نام بتا دیتا ہوں جو سَودیس کی طرح ہی بہت اچھے سبق سکھاتی ہیں۔ جیسے کہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام کے نام سے جڑی فلم آئی ایم کلام یا بلوا مبریلہ اور تارے زمین پر، آپ لوگوں کو جب بھی وقت ملے، آپ ان فلموں سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اب آخر میں سَودیس فلم کے ہی چند مصرعوں کے ساتھ آپ سے اجازت لیتا ہوں:

''یہ جو دیس ہے تیرا، سَودیس ہے تیرا، تجھے ہے پکارا،
یہ وہ بندھن ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا''

B-1, Second Floor, Thokar No. 7,
Shaheen Bagh, Abul Fazal Enclave-2,
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob: 9891522760

ڈاک ٹکٹ کی فنکاری

(چھوٹے دوستوں کی بڑی کہانیاں)

گلستاں......

ننھے ساتھیو! آج آپ موبائل اور کمپیوٹر کی مدد سے صرف کچھ ہی Clicks میں بڑے بڑے ہوم ورک، خطوط، تصویریں دنیا بھر میں بھیج دیتے ہیں، مگر اس سہولت سے پہلے خط و کتابت ڈاک گھر جائے بنا ممکن ہی نہیں تھی، ہوسکتا ہے آپ کبھی وہاں گئے ہوں کیوں وہ آج بھی مسلسل کام کر رہے ہیں اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے کام کرنے کے طور طریقے بھی بدلے ہیں۔ ویسے آج میں آپ کو اس ڈاک گھر کے ایک اہم رکن سے ملوا رہی ہوں۔

Philately (فلیٹلی) ڈاک ٹکٹ اور ڈاک سے متعلق مطالعہ کو کہتے ہیں۔ موٹے طور پر انھیں ہم دو زمروں میں بانٹتے ہیں۔ Token of Postage اور ثقافتی سفیر Cultural Ambassador

پہلے حصے کے ٹکٹ روزمرہ کے استعمال کے ہوتے ہیں، ان کا ڈیزائن بہت بیسک ہوتا ہے اور کم خرچے میں انھیں لمبی مدت کے لیے بڑی تعداد میں چھاپا جاتا ہے۔ دوسرے درجے میں موجود ڈاک ٹکٹوں کے ڈیزائن اور پرنٹ میں زیادہ جمالیاتی (asthetic) اور خوبصورتی کے پہلو کو خاص طور پر نظر رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ننھا ثقافتی سفیر ہونا بھی کوئی عام بات نہیں ہے۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ ایک آرٹسٹ اور آرٹ ایجوکیٹر (Art Educator) ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاک ٹکٹ کی ڈیزائنر بھی ہوں، ویسے فلیٹلی (Philately) کا مشغلہ ایک طرح سے ذہن کو نہ صرف تیز کرتا ہے بلکہ خوبصورتی اور قومی وراثت کا شعور بھی پیدا کرتا ہے۔

ایک ڈاک ٹکٹ چھوٹی سی کھڑکی ہوتا ہے جس سے ہم تاریخ، سیاست، سائنس، اہم شخصیات، ملکی غیر ملکی تقریبات جیسے لاتعداد موضوعات میں جھانک سکتے ہیں۔ آپ کو ایک بات اور بتاتی ہوں جب میں چھوٹی تھی تو ایک بچوں کی فلم دیکھی تھی Tommy Tricker and the stamp traveller جس کو Michael Rubbo نے بنایا تھا۔ فلم میں دو چھوٹے

بھائی بہن عجیب جادوئی صلاحیت سے خط میں لگے ڈاک ٹکٹ میں پہنچ جاتے تھے جیسے اگر اصلی ٹکٹ میں ایک گھڑ سوار بنا ہے تو جادو سے وہ اس گھڑ سوار کے ساتھ جا بیٹھتے اور باہری دنیا میں دیکھنے والے کو کوئی شک بھی نہ ہوتا اور ان کی مہم جوئی اس خط کے پوسٹ باکس میں ڈالتے ہی شروع ہو جاتی۔ اس فلم کا میرے اوپر ایسا اثر ہوا کہ خود بھی چاہنے لگی کہ کسی جادوئی طریقے سے ڈاک ٹکٹ کا حصہ بن جاؤں مگر جادو اور اصلی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ پھر بھی سالوں سال بعد فائن آرٹس کی پڑھائی کے بعد میں ڈاک ٹکٹ کا حصہ تو بنی لیکن ایک الگ انداز میں جو اپنے آپ میں کم مزیدار نہیں۔

میں آپ کو مختصر طور پر یہ بھی بتاتی چلوں کہ ایک ڈیزائنر کو ڈاک ٹکٹ بنانے کے لیے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ۲۶ نومبر یوم آئین منایا جاتا ہے اور پچھلے سال مجھے ہندوستانی ڈاک کی طرف سے اس اہم دن جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹ کو ڈیزائن کرنے کی ذمہ داری ملی۔ ڈاک ٹکٹ کو بنانے سے پہلے اچھی ریسرچ درکار ہوتی ہے۔ ایک ہی آئیڈیا کے کئی کئی لے آؤٹ اور اسکیچیز بنتے ہیں۔ اگر کوئی مشہور چہرہ (پوٹریٹ) بھی بنانا ہوتا ہے تو اس چہرے کا تاثر اور رنگوں کے امتزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آرٹ ورک اوریجنل ہونا بہت اہم ہے۔ میں زیادہ تر ہاتھ سے تصویر بناتی ہوں اور بعد میں اس پر کمپیوٹر پر کام کیا جاتا ہے۔

تو ننھے ساتھیو! یہ یومِ آئین کا ڈیزائن ایک چیلنج جیسا تھا کیوں کہ دنیا کے سب سے لمبے لکھے گئے آئین کو ایک ڈیڑھ انچ کے کاغذ پر ابھارنا آسان نہیں تھا مگر اپنی ریسرچ کے دوران ہی میں ہندوستان ڈاک کی خاص اجازت سے پارلیمنٹ کی لائبریری بلڈنگ میں پہنچی اور یہیں پر موجود کہانی سناتا انٹرایکٹیو اسٹوری ٹیلنگ میوزیم (interactive story telling museum) میں میری ملاقات ہوئی آئین ساز اسمبلی کے ممبران سے، یہاں سے لی گئی تصویر اور اصلی آئین کے بارڈر اور مختلف قومی نشانیوں کو کمپوز کرتے کرتے جو نتیجہ سامنے آیا وہ مسرور کن اور تسلی بخش تھا۔ آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے آئین کا ڈیزائن مشہور آرٹسٹ نندلال بوس نے کیا ہے۔ اس کے خطاط (کیلی گرافر) ہیں پریم بہاری نرائن زادہ۔

اچھا بچو! موقع ہو تو اس انٹرایکٹیو اسٹوری ٹیلنگ میوزیم میں ضرور جانا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی کہانی یہ میوزیم آپ کو بالکل انوکھے انداز میں بتاتا ہے۔ اس میوزیم کی تفصیلی جانکاری آپ کو اس کی ویب سائٹ پر بھی مل جائے گی۔ ایک اور اہم جگہ جو ذہن میں آتی ہے وہ دہلی میں سنسد مارگ پر موجود National Philatelic Museum ہے جو ڈاک بھون میں موجود ہے۔ یہاں بھی ہندوستان کی آزادی پر خاص سیکشن دیکھنے لائق ہے۔ میوزیم میں اسکولی بچوں کی اکثر ورک شاپ بھی ہوتی ہیں۔ آپ جب بھی یہاں جائیں گے تو محسوس کریں گے کہ چاروں طرف موجود یہ ننھے ڈاک ٹکٹ بڑی بڑی کہانیاں قصے خاموشی سے دکھاتے چلے جاتے ہیں، سناتے چلے جاتے ہیں اور جاتے جاتے مجھے بھی امریکی مزاح نگار جارش بلنگ کی ایک پیاری سی بات یاد آگئی۔ ''ڈاک ٹکٹ کی طرح بنو' وہ ایک چیز سے تب تک چپکا رہتا ہے جب تک منزل پر نہ پہنچ جائے۔

ہندوستانی ڈاک سے جاری چند میرے ڈیزائن

ہندوستان کی آزادی سے جڑے چند ڈاک ٹکٹ

آزاد ہندوستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ

آرٹسٹ فدا حسین کے برش سے

انوکھے ٹکٹ

۱۔ بھوٹان نے ڈاک ٹکٹ کے سلسلے میں الگ ہی مثال قائم کی ہے۔ ۲ جون ۱۹۶۹ کو Steel کی صنعتی اہمیت دکھانے کے لیے انھوں نے پتلے سے Steel کے ٹکڑے پر ہی ٹکٹ چھاپ دیا۔

۲۔ ۲۰۰۶ میں آسٹریا نے ایک ٹکٹ نکالا جس میں 0.03 گرام شہابی پاؤڈر (Meterorite) کا پتھر موجود تھا۔ جو 19 کلو کے Morocco میں پائے گئے شہابی پتھر میں موجود تھا۔

۳۔ ۱۵-اپریل ۱۹۷۳ کو بھوٹان نے دنیا کا پہلا بولنے والا ڈاک ٹکٹ نکالا۔ یہ Vinyl Record ساٹھ کی تعداد میں تھے اور مختصر بھوٹانی تاریخ اور لوک گیت سناتے۔

۴۔ UK Royal Mail نے تو تین خوشبوؤں اور ذائقوں میں چاکلیٹ کے ڈاک ٹکٹ نکالے لیکن یہ کھانے کے لیے نہیں تھے۔ البتہ اگر کوئی ان کو چاٹ لے تو منہ کچھ تو میٹھا ہو ہی جاتا تھا۔

۵۔ ہندوستان نے بھی پھولوں پر Scented Stamps خوشبو والے ٹکٹ نکالے ہیں اور ہندوستان نے اپنا پہلا تکونہ ڈاک ٹکٹ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۵ کو Border Road Organisation کے پچیسویں سال گرہ کے موقع پر نکالا۔

دنیا کا سب سے نایاب ڈاک ٹکٹ

گیانا جب انگریزوں کے قبضہ میں تھا تو برٹش گیانا (British Guiana) کہلاتا تھا۔ یہیں ایک بار جب ڈاک ٹکٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ پوسٹ آفس پہنچتے پہنچتے کھو گیا تو ایمرجنسی میں پہلی اور آخری بار کچھ ڈاک ٹکٹ نکالے گئے اور ان ہی میں سے بچارہ گیا One Cent Magenta۔

H. No. 728,
St. No. 29,
Main Road,
Indra Chowk,
Jafrabad,
Delhi-110053
M:9310461643

پندرہ اگست

محمد سراج عظیم......

خالد دادی کے پاس آیا اور بولا ''دادی مجھے دس روپے دے دیجیے جلدی''۔ ''کیا بات ہے خالد اتنی جلدی کیا ہے؟ کیا ہوگیا؟ اتنا کیوں ہانپ رہا ہے بھیّا'' دادی نے خالد کو ہانپتے ہوئے دیکھ کر کئی سوالات کر ڈالے۔

''ارے! دادی آپ بھی سوال بہت کرتی ہیں۔ جلدی سے پیسے دیجیے مجھے کل پندرہ اگست کے لیے پتنگیں لانی ہیں۔'' خالد نے الجھتے ہوئے کہا۔

''کل پتنگیں اُڑاؤ گے۔ معلوم ہے کل ہماری آزادی کا دن ہے۔ یہ دن کتنا قیمتی ہے۔ اس کی کتنی اہمیت ہے۔ ہمیں یہ آزادی انگریزوں سے کتنی قربانیوں کے بعد ملی ہے۔'' دادی نے خالد کی بات کے جواب میں کہا۔

''ارے دادی! آپ نہ جانے کیا باتیں کرنے لگیں؟ جلدی سے پیسے دیجیے میرے دوست باہر کھڑے ہیں۔'' خالد اور چڑچڑانے لگا تھا۔

''ارے بچے! جب تمھیں اپنے بزرگوں اور اپنے ماضی کے بارے میں نہیں معلوم ہوگا تو تم کسی کو کیا بتاؤ گے؟ آؤ میں تمھیں بتاتی ہوں کہ آزادی کے لیے ہندوستانیوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ ہر ہندوستانی نے اپنے طور پر انگریزوں سے لڑائی لڑی اور قربانی دی ہے۔'' ابھی دادی یہ سب بتا ہی رہی تھیں کہ خالد ایک دم غصہ ہوگیا۔ ''دادی آپ اپنی کہے جا رہی ہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میرے دوست انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ باتیں میں بعد میں بھی سن لوں گا۔'' خالد کا منہ پھول گیا تھا۔

''اچھا یہ لو پیسے۔ جب پتنگیں لے کر آجاؤ گے تو میں تمھیں قلعۂ معلّٰی جس کو تم لال قلعہ کہتے ہو اس کی ایک کنیز شریفن اور شہزادیوں کے بارے میں بتاؤں گی جب انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کیا اور شریفن نے شہزادیوں کو ان سے بچایا۔'' دادی نے خالد کو دس روپے دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں دادی! میں پتنگیں لے آؤں تو لال قلعہ کی کہانی سنوں گا''۔ خالد نے دس روپے کا نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے گھر سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

خالد تقریباً دو گھنٹے بعد پانچ چھ پتنگیں جو مختلف رنگوں میں تھیں، اس میں ایک ترنگے جھنڈے کی طرح بھی تھی وہ اور ڈور مانجھا لے کر لوٹا اس کے ساتھ اس کے دوست بھی تھے۔ اس نے آتے ہی دادی سے کہا ''دیکھا دادی کتنی خوبصورت پتنگیں ہیں۔ کل میں اور میرے یہ سارے دوست لال قلعہ کے میدان پر پریڈ دیکھنے اور پتنگیں اُڑانے جائیں گے۔''

''ہاں بیٹا! آج تم جس آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہو۔ ہمارے اس پیارے ملک ہندوستان کو انگریزوں نے غلام بنالیا تھا۔ ہمیں ہمارے ملک میں ہی انگریزوں کا ظلم برداشت کرنا پڑتا تھا۔ دادی کہہ رہی تھیں۔ تبھی خالد نے کہا: ''ارے دادی یہ سب تو معلوم ہے آپ جو شہزادیوں اور کنیز شریفن کی کہانی کہہ رہی تھیں وہ بتائیے''۔

''ہاں بتاتی ہوں، تمھیں ہر چیز میں عجلت رہتی ہے۔ پہلے تم اور تمھارے دوست آرام سے بیٹھ جاؤ'' دادی نے خالد اور اس کے دوستوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی دادی! اب بتائیے ہم سب لوگ آرام سے بیٹھ گئے'' خالد نے اپنے دوستوں کے بیٹھ جانے پر کہا۔

دادی نے کہنا شروع کیا: ''دیکھو خالد بیٹا اور تمھارے دوست سب لوگوں کو یہ تو معلوم ہوگا کہ جب ہمارے ملک کے لوگ انگریزوں کی ظلم و زیادتی سے پریشان ہوگئے تب پورے ملک میں لوگ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ مختلف ریاستوں اور تنظیموں سے دہلی کے تخت پر رونق افروز بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا کمانڈر بنالیا یعنی ان کی ہی سرپرستی میں انگریزوں سے آزادی کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انگریز اس بات سے پریشان ہوگئے۔ انھوں نے سوچا کہ ہندوستان کے بادشاہ کو گرفتار کر کے ہم قلعۂ معلّٰی پر قبضہ کرلیں گے تو یہ آزادی کی تحریک ختم ہوجائے گی اور لوگ اپنے بادشاہ کی گرفتاری اور قلعہ پر قبضہ کے بعد ڈر کر ہمت ہار جائیں گے اور

آزادی کی جدوجہد چھوڑ دیں گے''۔ تبھی خالد کا دوست عبداللہ بولا: ''دادی کیا انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کرلیا تھا؟''

''سنو بیٹا! آگے سنو!'' دادی ایک دم بولیں اور آگے کہنے لگیں۔ ''انگریز ہندوستانیوں کی جدوجہد سے بوکھلا گئے اور ان کی ظلم وزیادتی میں اور شدت آگئی مگر آزادی کے متوالے ان سب زیادتیوں کے باوجود اپنی کوششوں سے ہمت نہیں ہارے۔ تب انگریز ہندوستانی شہریوں پر فوج کے ذریعے زیادتی کرنے لگے۔ جگہ جگہ فوجی جلسے جلوسوں پر گولیاں چلاتے اور ہزاروں ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر کے ذریعہ ہزاروں لوگوں پر گولی چلا کر مروا ڈالا۔ خیر'' دادی آزادی کی لڑائی کے بارے میں بتا رہی تھیں تبھی خالد پھر بولا ''ارے دادی آپ کہاں کہاں بھٹک جاتی ہیں لال قلعہ کی شہزادیوں اور شریفن کے بارے میں بتائیے نا''۔

''ہاں! بتا تو رہی ہوں تم لوگ بیچ میں بول دیتے ہو۔ اب دھیان سے سنو۔ پورے ملک میں آزادی کا بگل بج چکا تھا۔ ہندوستان کے ہندو، مسلم، سکھ، دیہاتی، شہری، مرد وعورت سب آزادی کی لڑائی کے لیے پورے ملک میں تیار ہوگئے تھے۔ اب انگریزوں نے پورے ملک کے راجاؤں اور نوابوں پر فوجی کارروائی شروع کردی۔ بہت سے ہندوستانی اور قلعہ معلّٰی کے فوجی مارے گئے تھے۔ لال قلعہ میں مینا بازار میں مغل شہزادیاں خریداری کر رہی تھیں۔ ان کی کنیز شریفن ان کے ساتھ تھی۔ تبھی قلعہ کا دربان بھاگتا ہوا آیا سب سے چیختا ہوا بولا ''بھاگو انگریزوں کی فوج قلعہ کے پاس پہنچ گئی ہے''۔ یہ سننا تھا کہ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ شریفن بھاگتی قلعہ کے پھاٹک کی طرف دیکھنے کے لیے بھاگی اور فوراً ہی گھبرائی ہوئی واپس آئی شہزادی صاحبان جلدی چلیے انگریز فوج کچھ ہی دیر میں قلعہ میں داخل ہوجائے گی جلدی کیجیے۔'' وہ چیختے ہوئے بولی ''چلیے رنگ محل کی طرف اس کے نیچے کی سرنگ میں چلیے۔'' یہ کہہ کر شریفن شہزادیوں کو جلدی جلدی رنگ محل کی جانب لے جانے لگی، شہزادیاں بھی گھبرائی ہوئی تھیں وہ بھی تیز قدم اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگیں مگر دیر ہوچکی تھی۔ انگریز فوج قلعہ میں داخل ہوچکی تھی۔ فوج میں پیدل سپاہی اور گھوڑوں پر سوار انگریز فوج کے افسر سب تھے۔ انگریز فوج نے مینا بازار کے دکانداروں کو مارنا اور ڈانٹنا شروع کردیا۔ شریفن نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک انگریز فوجی کی آنکھوں میں اپنی انگلیاں گھسیڑ دیں اور اس کی بندوق چھین لی۔ فوجی تڑپتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ شریفن چیخ کر شہزادیوں سے بولی ''شہزادی صاحبان میں میں نے آپ کو جو بتایا ہے وہ کیجیے اللہ آپ کا مددگار رہے میں جب تک ان لوگوں کو یہیں روکتی ہوں۔'' شہزادیاں رنگ محل کی طرف دوڑ گئیں۔ شریفن انگریز فوج کے سامنے کھڑی ہوکر گولی چلانے لگی دو تین فوجی اس کا شکار ہوگئے۔ یہ دیکھ کر انگریز جنرل غصہ میں بھر گیا اس نے اپنے فوجیوں کو آرڈر دیا۔ ''ہے!! شوٹ دی لیڈی'' (اے! اس عورت کو گولی مار دو)۔ ایک فوجی نے شریفن کے گولی ماردی شریفن زمین پر گر گئی مگر اس نے اپنی جان دے کر شہزادیوں کو بچا لیا تھا۔ شہزادیاں اس سرنگ میں داخل ہوکر کہاں گئیں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا لیکن شریفن نے اپنی وفاداری نبھاتے ہوئے شہزادیوں کی عزت و ناموس کی حفاظت اپنی جان دے کر کی تھی۔ انگریز فوج شہزادیوں کو تلاش کرتی رہی لیکن ان کا سراغ نہ مل سکا۔ بیٹا اس طرح کے بہت سے جانباز لوگوں کے قصوں سے ہماری آزادی کی داستان بھری پڑی ہے۔ اس طرح کے نامعلوم جانبازوں کے نام ہمارے انڈیا گیٹ پر کنداں ہیں۔ اسی لیے بیٹا ہماری یہ آزادی ان لوگوں کی قربانیوں کی وجہ سے بہت قیمتی ہے۔ ہم لوگوں کو ان کی قربانی نہیں بھولنا چاہیے''۔ دادی یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں۔ خالد اور اس کے دوست دادی سے بولے دادی ہم ان لوگوں کے بارے میں ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ ہمیں پندرہ اگست ان کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔

A-47, Zakir Bagh, Opp. Surya Hotel,
Okhla Road, Jamia Nagar,
New Delhi-110025
Mob: 9990661282

''آزادی کا جانباز سپاہی''

اسکرپٹ کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ جیلانی

آج ۱۵ راگست یوم آزادی کا دن تھا۔ دانش اور اس کا دوست پرکاش آزادی کا جشن اپنے اسکول میں منا کر آرہے تھے۔ پرکاش بھارت کی آزادی کی بابت زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے راستے میں دانش سے معلوم کیا۔

جب دانش پرکاش کو لے کر گھر پہنچا اس وقت دانش کی ممی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھیں۔

دانش پرکاش کو لے کر دادی کے کمرے میں پہنچا
آزادی کا فنکشن منا کر آ گئے بیٹا۔
جی دادی!۔۔۔ دادی آج کے دن کے بارے میں تو آپ کو کافی جانکاری ہوگی، ہم دونوں کو بتاؤ نا۔

ہاں ہاں!۔۔۔ کیوں نہیں، آؤ بیٹھو۔
واہ! میری پیاری دادی۔

دیکھو بیٹا!
آج یوم آزادی کا دن ہم بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں کیونکہ یہ ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو، رفیع احمد قدوائی اور سردار پٹیل جیسے آزادی کے متوالوں نے ہزاروں سختیاں سہہ کر اہنسا کے راستے پر چلتے ہوئے ڈیڑھ سو سالہ انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی۔

۔۔۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور بڑی تعداد میں قربانیاں دی تھیں۔

۔۔۔ ان ہی کی بدولت ہمارا یہ عزیز ملک آج آزادی کے نغموں سے گونج رہا ہے۔

دادی! کسی مجاہد آزادی کے بارے میں بتائیے
ہاں دادی! بتائیں۔
اچھا اچھا!۔۔۔ بتاتی ہوں، مجھے سوچنے دو۔
۔۔۔اور دادی سوچ میں پڑ گئیں۔
آخر
اچھا تو سنو! میں ایک ایسے مجاہد آزادی کی کہانی سناتی ہوں جس کی پیدائش مقدس شہر مکہ معظّمہ میں ۱۱رنومبر ۱۸۸۸ء کو ہوئی تھی۔ پھر یہ کیسے ہندوستان آیا؟ ۔۔۔ایک عجیب واقعہ ہے۔
دادی! وہ کیا واقعہ تھا؟
سنو پرکاش بیٹا!۔۔۔ ۔۔۔کہتے ہیں، ایک حادثے میں اس بچے کے والد کی بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔
۔۔۔مکہ معظّمہ میں کوئی خاطر خواہ علاج نہ ہونے کی بنا پر بچے کے والد نے ہندوستان بغرض علاج آنے کا ارادہ کیا۔
۔۔۔اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ان کا پایہ تخت کلکتہ میں تھا۔

مولانا آزاد بچپن سے بڑے ذہین تھے۔انھیں
مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔گھر والوں سے چوری چھپے
کتابیں پڑھا کرتے تھے۔کم عمری میں انھوں
نے بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔جیب خرچ کا
ایک بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا کرتے تھے۔

ڈانٹ سے بچنے کے لیے ایک بار انھوں
نے رضائی میں موم بتی رکھ کر لیٹے لیٹے
کتاب کا مطالعہ کیا،مگر بے احتیاطی میں
رضائی میں آگ لگ گئی اور راز فاش
ہو گیا۔

۔۔۔ان کے مضامین دیکھ کر مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے اس وقت کے نامور عالم اور ادیب ان کی صلاحیت کے قائل ہو گئے۔

۔۔۔۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے ’’الہلال‘‘ نام کا اخبار جاری کیا جس نے قوم میں ایک نئی روح پھونکی۔

مولانا آزاد ۱۹۲۳ء میں محض ۳۵ سال کی عمر میں کانگریس کے صدر مقرر ہوئے۔ مولانا کا جنگ آزادی میں بڑا سرگرم کردار رہا۔ اس جرم میں انگریزوں نے انھیں متعدد بار گرفتار کیا، لیکن وہ ڈگمگائے نہیں۔
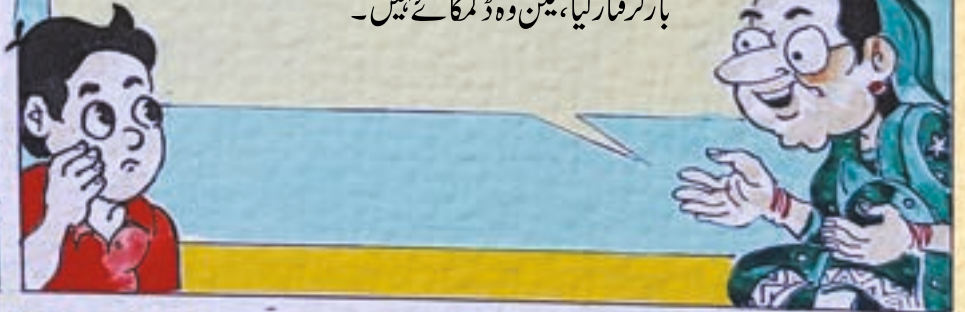
۔۔۔انتہا یہ کہ جب ان کی بیوی زلیخا بیگم بیمار ہوئیں اور ان کا انتقال ہو گیا تو انھیں پیرول پر رہائی ملنے والی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔

مولانا آزاد ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک برابر ہندو مسلم اتحاد اور غیر منقسم ملک کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی وکالت کرتے رہے کہ ہندوستان کی بقا ہندو مسلم اتحاد میں ہی ہے۔
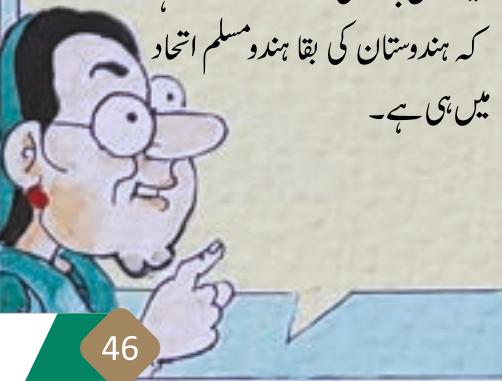
۔۔۔وہ ہندوستان کی سا
لمیت کے خواہاں تھے۔
۔۔۔انھوں نے کہا تھا ''اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر کر آئے اور دہلی
کے قطب مینار سے اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مِل سکتا ہے۔
بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے
دستبردار ہو جاؤں گا کیوں کہ سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو ہندوستان کا نقصان
ہوگا۔ اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ انسانیت کا نقصان ہوگا۔''
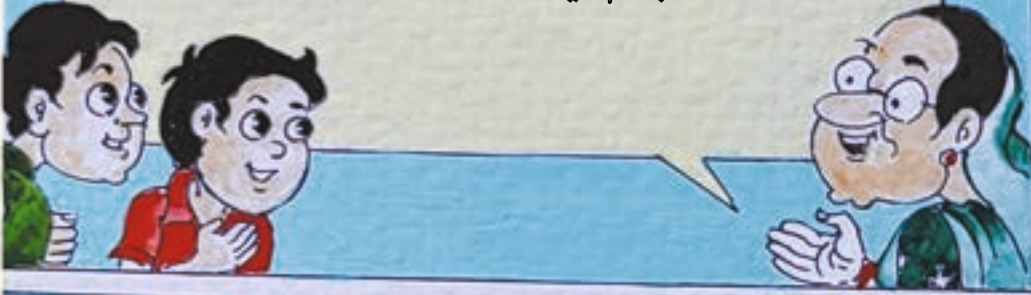
۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان
آزاد ہوا تو مولانا کو ہندوستان کا
پہلا وزیرِ تعلیم بنایا گیا۔

ان کی وزارت میں تعلیم کے میدان میں خوب کام ہوئے۔ سائنسی
تحقیقات کو بڑھاوا ملا، جوہری توانائی پر کام کی ابتدا ہوئی۔ انجینئرنگ
میں ممتاز مقام رکھنے والے ادارے آئی آئی ٹی کا قیام مولانا کے دورِ
وزارت میں ۱۹۵۱ء میں عمل میں آیا۔ انھوں نے بمبئی، دہلی، مدراس،
کانپور اور کھڑک پور میں ان اداروں کی بنیاد ڈالی۔
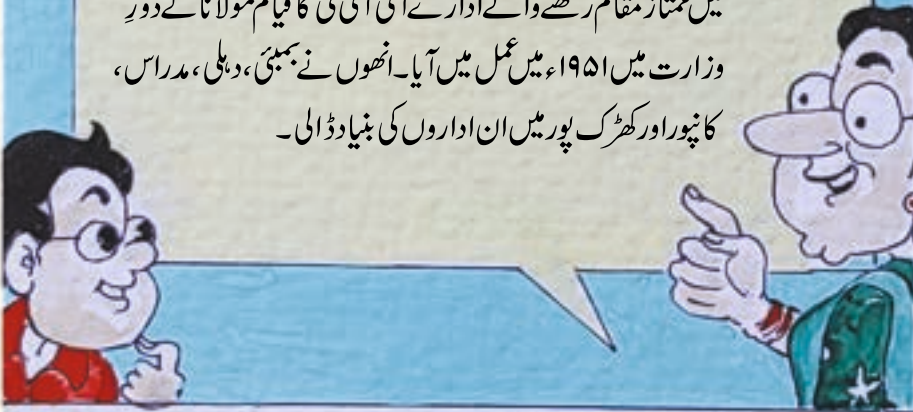
۔۔۔آج ہمارا ملک سائنس،
ٹیکنالوجی، خلائی سائنس اور
آئی آئی ٹی کے معاملے میں جتنا
آگے ہے اس کی کامیابی کا سہرا
مولانا آزاد کے سر بندھتا ہے۔

۔۔۔ان کے زمانے میں ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی،
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ آبی توانائی کے لیے
باندھ تعمیر کیے گئے۔

۔۔۔حکومت ہند نے ان کی قومی وملی اور وطنی خدمات، ان کے جذبۂ حب الوطنی اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے ان کی بے شمار قربانیوں کے مدنظر رکھتے ہوئے بھارت کے سب سے بڑے اعزاز ''بھارت رتن'' سے ۱۹۶۲ء میں سرفراز کرکے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

اتنی اچھی جانکاری پا کر دونوں نے دادی کا شکریہ ادا کیا۔

© SHAH' FEATURE SERVICE - DELHI. MOB. 8800972366 Shahcartoonist@gmail.com

مولانا آزاد کا قول:

بلندی ہمت مانگتی ہے، چاہے وہ ایوریسٹ پہاڑ کی چوٹی ہو یا آپ کا کام۔۔۔اسی لیے اگر اپنے مشن میں کامیاب ہونا ہے تو اپنی منزل کے لیے ایک طرفہ عقیدت لازم ہے۔

ختم شد

35, Seva Sadan Block Complex-12, 1st Floor, Street No.1, Mandawali, Fazalpur, Delhi-110092
Mob: 8800972366

وقت کی چوری

......ڈاکٹر سیّد اسرارالحق سبیلی

آج کا دن بچوں کے لئے بہت یادگار دن تھا،آج مدرسہ کے سارے بچے خوش خوش نظر آرہے تھے،ان کا سالانہ امتحان مکمّل ہو چکا تھا،امتحان کا بوجھ سر سے اترنے اور ہاسٹل سے اپنے اپنے گھروں کو جانے کی خوشی میں وہ پھولے نہیں سما رہے تھے،صبح کا ناشتہ کر کے وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کود میں مصروف تھے،تھوڑی ہی دیر میں مدرسہ کا سالانہ جلسہ شروع ہونے والا تھا جس میں چند بچوں کو تقریری وتحریری مظاہرہ بھی پیش کرنا تھا،اور جلسہ کے اختتام پر تکلّف ظہرانہ سے انہیں لطف اندوز بھی ہونا تھا،باورچی خانہ سے بریانی اور ڈبل کے میٹھے کی خوش بو بچوں کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھی اور اب وہ اٹھلاتے ،خراماں خراماں اور کشاں کشاں جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بچوں کے پروگرام کی کارروائی بچوں کی انجمن الفلاح کے ناظم میاں مظفّر نے شروع کی،جو بچوں میں بہت مقبول تھے اور جسے ہم مذاق میں سیکولر نیتا کہا کرتے تھے،میاں مظفّر،اونچی جماعت کے طلبا اور اساتذۂ کرام نے بڑی محنت اور شفقت سے بچوں کو تیّار کیا تھا،بچوں نے دھواں دھار تقریریں کیں،عمدہ مضامین و مقالات پڑھے،حمد،نعت،قرأت اور تعلیمی ڈرامے بہت سلیقہ سے پیش کئے۔

سب سے آخر میں مدرسہ کے ناظم صاحب مائک پر جلوہ افروز ہوئے،انہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں بچوں کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لیا،نصاب کی تکمیل اور امتحان میں بچوں کے بہتر مظاہرہ پر اطمینان کا اظہار کیا،اس کے ساتھ ہی انھوں نے طلبا کو غیر نصابی کتب اور اخبار و رسائل کے مطالعہ اور مضامین و کہانیاں لکھنے کے لئے وقت نکالنے بلکہ اس کے لئے تھوڑی چوری کی ترغیب دی۔

چوری کا نام سنتے ہی بچے چونک پڑے کہ آج ناظم صاحب کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ہمیں چوری سکھا رہے ہیں۔انہوں نے مزید وضاحت کی:

بچو!چوری بہت بری چیز ہے،لیکن آج میں تمہیں ایک ایسی چوری بتاؤں گا جو ہرگز بری نہیں ہے،اس چوری کے ذریعہ تمہاری شخصیت میں چار چاند لگ جائیں گے،تمہارا نام روشن ہوگا،تم دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں میں شمار کئے جاؤ گے اور وہ ہے وقت کی چوری۔

تم درسی کتب،کھیل کود،فضول دوستی اور مٹر گشتی سے تھوڑا وقت چرا کر اگر کتب خانہ کی کتب و رسائل اور اخبارات کے مطالعہ میں صرف کروگے اور اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں مضامین اور کہانیاں وغیرہ تحریر کروگے تو تمہارا شمار مصنّفین اور اہلِ قلم میں ہوگا اور ایک دن تم بڑے مصنّف،مترجم،محقق،شاعر،ادیب،فلسفی اور قائد ومفکّر کی حیثیت سے یاد کئے جاؤگے،ناظم صاحب نے عبدالماجد دریابادی اور جوش ملیح آبادی جیسے ادیب وشاعر کی مثال دی،جو اسی طرح چوری چھپے غیر نصابی کتب و جرائد پڑھ کر اور لکھنے کی مسلسل مشق کر کے بڑے آدمی کہلائے۔

آج تمہارے والدین اور اساتذہ کو صرف تمہارے پاس ہونے کی فکر ہے،اگر تم پاس نہیں ہوئے تو ان کی بے عزّتی ہوگی،اس لئے وہ تمہیں ہر وقت درسی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیں گے،لیکن یاد رکھو!امتحان میں پاس ہونا اور مضامین کو سمجھنا دو الگ الگ چیزیں ہیں،ایک بچہ اگر امتحان میں ۹۰-۹۵ فی صد نشانات حاصل کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو تمام مضامین پر عبور ہے،ہوسکتا ہے کہ اس نے محض رٹ کر امتحان کا پرچہ لکھا ہو۔

اس کے برخلاف جس بچہ نے رٹنے کے بجائے سمجھ کر اپنے الفاظ میں امتحان کے پرچے حل کئے ہوں،ہوسکتا ہے کہ اس کو امتحان میں کم نشانات حاصل ہوئے ہوں،لیکن ایسا بچہ آگے چل کر بہت ترقّی کر جائے گا۔

اپنے الفاظ میں امتحانی پرچے تحریر کرنے کے لئے خود سے لکھنے کی مشق ضروری ہے اور یہ مشق مضمون نویسی،کہانی ونظم نویسی،ڈرامے،تقریر اور مباحثہ کے مقابلوں میں حصّہ لینے اور اپنے طور پر مضامین اور کہانیاں وغیرہ

لکھنے کی مشق اور اصلاح سے حاصل ہوتی ہے۔

آج بچے امتحان کا نام سنتے ہی گھبرا جاتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون کو سمجھ کر اپنے طور پر لکھنے کے بجائے رٹ کر امتحان کے پرچے لکھتے ہیں اور امتحان ہال میں مارے ڈر کے بھول جاتے ہیں اور کسی طرح الٹا سیدھا لکھ کر پاس ہو جاتے ہیں، لیکن امتحان گاہ سے نکلنے کے بعد انہیں مضمون کا کچھ حصّہ بھی یاد نہیں رہتا ہے۔

مگر جو بچے خود سے مضمون اور کہانیاں لکھنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ بڑے سے بڑے امتحان میں شرکت کرنے سے نہیں گھبراتے اور ہمیشہ اچھے نمبرات سے کامیاب ہوتے ہیں۔

حضرت ناظم صاحب نے بچوں سے عہد لیا کہ وہ آئندہ تعلیمی سال سے صرف رٹ کر امتحان کا پرچہ نہیں لکھیں گے، بلکہ خود ہی سے امتحان میں سوالات کے جوابات تحریر کریں گے اور اس کے لئے درسی کتب کے علاوہ معاون درسی کتب، ادبی کتب و رسائل اور اخبارات کا مطالعہ ضرور کریں گے اور اس کے لئے اپنے نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) میں سے تھوڑا وقت چوری کریں گے، نہیں چوری نہیں، اپنے نجی نظام الاوقات میں سے تھوڑا وقت اور چھٹیوں کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ وقت کتب و رسائل کے مطالعہ میں صرف کریں گے۔

چھٹیوں میں گھر جانے کے بعد اکثر بچوں نے ناظم صاحب کی نصیحتوں کو بھلا دیا، لیکن کئی ہونہار اور لائق بچوں نے نئے تعلیمی سال سے ناظم صاحب کے عہد پر عمل کیا، انہوں نے امتحان میں پچھلے سال کے مقابل اچھے نمبرات حاصل کئے۔ ان کو لائبریری کی کتب و رسائل میں طرح طرح کے موضوعات پر دلچسپ مضامین، کہانیاں، ناول، ڈرامے اور شاعری پڑھ کر بہت مزہ آنے لگا، وہ رات کے بارہ بجے تک لائبریری میں رہتے اور چھٹیوں کے دنوں میں پورا دن مطالعہ کرنے یا لکھنے میں مصروف رہنے لگے، دوسرے بچے ان کو کتاب کا کیڑا کہہ کر چڑانے لگے، جب کہ وہ مدرسہ کے دیواری جریدوں (Wall Magazines) اور شہر کے اخبارات و رسائل میں اپنے مضامین اور کہانیاں دیکھ کر کافی خوش ہوتے اور اچھے سے اچھے رسائل میں اپنی تحریریں شائع کرانے کی خاطر چھٹیوں کے دنوں میں بھی زیادہ تر لکھنے پڑھنے میں وقت گزارتے۔ کسی نے سچ کہا ہے: ''اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا''۔

مدرسہ کے ناظم صاحب چوں کہ خود مشہور کالم نگار اور کئی کتابوں کے مصنّف تھے، وہ اپنے مدرسہ کے لائق فرزندوں کی تحریریں اخبارات و رسائل میں دیکھ کر ان بچوں سے بہت خوش رہنے لگے اور ان کے لئے خصوصی وظیفہ مقرر فرمایا۔

Dr. Syed Asrarul Haque
Asst. Professor & HOD Urdu
Govt. Degreee & P.G.College Siddipet-502103
Telangana (TS)
Mobile: 9823755795

شہید اعظم بھگت سنگھ

......ڈاکٹر نشاں زیدی

مشہور کہاوت ہے کہ ''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں''یعنی انسان میں جوخوبیاں یا خامیاں ہوتی ہیں اس کا اندازہ بچپن سے ہی ہوجاتا ہے اور اگر بات ہو بہادر انسان کی تو اس کی بہادری کا اندازہ اس کے بچپن کے کھیلوں سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔تو بچو! ہم بات کررہے ہیں شہید اعظم بھگت سنگھ کی جنھوں نے نوجوانی میں ہی خود کو ملک کے لئے قربان کردیا تھا۔

چھوٹی عمر یعنی بچپن سے ہی بھگت سنگھ کے کھیل ایسے ہوتے تھے جس سے ان کی بہادری ظاہر ہوتی تھی۔وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جب کھیلتے تو آپس میں دو گروپ میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے پر حملہ کرکے جنگ کی تیاری کرتے۔بھگت سنگھ کے ہر کام سے ان کے نڈر اور بہادر ہونے کا اندازہ ہوتا۔

ایک مرتبہ کی بات ہے کہ بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ بھگت سنگھ کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے دوست نند کشور مہتا سے ملنے ان کے کھیت پر گئے۔دونوں دوست باتوں میں لگ گئے اور ننھا بچا بھگت اپنے کھیل میں لگ گیا،اچانک نند کشور کا دھیان بھگت سنگھ کی طرف گیا اور وہ بھگت سنگھ کو غور سے دیکھنے لگے۔بھگت سنگھ مٹی کے ڈھیروں پر چھوٹے چھوٹے تنکے لگا رہے تھے،ان کے اس کھیل کو دیکھ کر نند کشور بڑے پیار سے بھگت سنگھ سے باتیں کرنے لگے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''نند کشور مہتا نے پیار سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی بھگت سنگھ'' بچے نے جواب دیا۔

''تم کیا کرتے ہو''نند کشور مہتا نے مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھا۔

''میں بندوقیں بیجتا ہوں۔''ننھے بھگت نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بندوقیں......؟''مہتا نے چونک کر کہا۔

''ہاں بندوقیں''

''وہ کیوں؟''

''اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے۔''

''تمہارا مذہب کیا ہے۔''مہتا کی دلچسپی بڑھ گئی۔

''حب الوطنی! ملک کی خدمت کرنا۔''

تو بچو! اندازہ ہوا نا کہ بھگت سنگھ بچپن سے ہی بہادر تھے اور حب الوطنی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔بھگت سنگھ کے بچپن کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان کی بہادری،حب الوطنی اور بے خوفی کا ثبوت ملتا ہے۔بھگت سنگھ کی پیدائش 28 ستمبر 1907 کو پنجاب کے ضلع لائل پور کے گاؤں بنگا (پاکستان) کے ایک سکھ خاندان میں ہوئی۔جب بھگت سنگھ پیدا ہوئے تو اس وقت ان کے والد کشن سنگھ،چچا اجیت سنگھ اور سورن سنگھ جیل میں تھے۔بھگت کا پورا خاندان تحریک آزادی کا حصہ تھا۔بھگت سنگھ نے بھی ننھی عمر سے ہی آزادی کو اپنا مقصد بنالیا۔وہ کرتار سنگھ سرابھا اور لالہ لاجپت رائے سے بہت متاثر تھے۔کرتار سنگھ نے بیس برس کی عمر میں اپنے کو ملک پر قربان کردیا تھا۔آس پاس کے حالات نے ننھے بھگت سنگھ کے خیالات کو ہوا دی۔جلیاں والا باغ حادثہ نے بھگت سنگھ کے ننھے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔انھوں نے جلیاں والا باغ سے لال مٹی اٹھائی،ایک بوتل میں ڈالی اور دل میں عہد کرلیا کہ یہ مٹی مجھ میں ملک کے لئے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرے گی۔آزادی کا بیج بویا جاچکا تھا۔بھگت سنگھ آزادی کے خواب دیکھنے لگے اور انگریز مخالف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور جیل بھی گئے۔انہوں نے دشمن کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا۔

7 اکتوبر 1930 کو وکیل نے بھگت سنگھ کو اطلاع دی کہ ان کے لئے سزائے موت کا حکم آیا ہے۔بھگت سنگھ نے بے خوف ہوکر جواب دیا۔''دشمن کے آگے سر جھکانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگالوں۔''

بھگت سنگھ نے 23 برس کی عمر میں 23 مارچ 1931 کو خوشی خوشی پھانسی کے پھندے کو اپنے گلے کا ہار بنالیا۔

B-63/S-2,D.L.F. Colony
Sahibabad,Distt.Ghaziabad(201005)
M-9873297860

آزادی کی امنگ

محمد رفیع الدین مجاہد......

"مجھے بلی کا بچہ چاہیے۔۔۔ میں اسے پالوں گا اور دودھ بھی لاکر پلاؤں گا۔" اسید نے بس یہی ضد پکڑ لی تھی اور امی ابو سے بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ اسے کہیں سے بھی بلی کا ایک بچہ لاکر دیں۔ بات یہ تھی کہ پڑوس میں اس سے کچھ بڑا اس کا دوست رہتا تھا جس نے بلی کا ایک بچہ پال رکھا تھا جو اب بڑا ہو رہا تھا۔ اس کے دوست نے بلی کے اس بچے کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بلی کا وہ بچہ گھر کے سبھی لوگوں سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اسید بھی وہاں جاتا رہتا تھا اور گھنٹوں اس بلی کے بچے سے کھیلا کرتا تھا۔ بس تب ہی سے اس نے بلی کے بچے کی رٹ لگا رکھی تھی۔ "بیٹا! کہیں کسی کے یہاں بلی کا بچہ ملنے تو دو! ہم تمھیں ضرور لا کر دیں گے۔" ابو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کتنے دنوں سے یہی کہہ رہے ہیں ابو! ابھی تک ملا نہیں بلی کا بچہ!" اس نے رو دینے جیسی صورت بنا کر کہا۔ "ہم نے چار پانچ جان پہچان والے لوگوں سے کہہ رکھا ہے بیٹا! جن کے یہاں بلی ہے۔ ان کی بلی کے جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوگا، ہم ایک لے لیں گے تمہارے لیے۔" امی نے بھی اسے تسلی دی۔

"ن۔۔نہیں نہیں مجھے جلد سے جلد بلی کا بچہ چاہیے۔" وہ بولا۔ "ابو! ہم دونوں بازار چلتے ہیں اور وہاں سے بلی کا بچہ خرید کر لاتے ہیں۔" اس نے ایک دن اپنے ابو سے کہا۔ اس کی اس معصومیت پر ابو اور امی دونوں ہنس پڑے اور اس کے بہن بھائی اس کا مذاق اڑانے لگے۔ "بیٹا! بلی کا بچہ بازار میں کسی دکان پر نہیں ملتا کہ ہم خرید کر لے آئیں۔ جیسا کہ تمہارے لیے کھلونے خرید کر لاتے ہیں۔" ابو نے کہا۔ "لیکن تم بلی کے بچے کی وجہ سے کہیں اپنی پڑھائی کا نقصان نہیں کر بیٹھنا۔" امی نے اسے تاکید کی۔ "نہیں امی۔۔۔ میں پڑھوں گا بھی۔ جب سے لاک ڈاؤن لگا ہے میں گھر پر پابندی سے اسکول اور مدرسے کے اسباق پڑھ رہا ہوں۔ اسکول اور مدرسہ بند ہے اس لیے میں گھر سے باہر بھی کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ بس مجھے بلی کا بچہ چاہیے۔" امی ابو نے اسے تسلی دی کہ وہ ضرور کہیں نہ کہیں سے اس کے لیے بلی کا بچہ لائیں گے۔

اسید کوئی اتنا چھوٹا بچہ بھی نہیں تھا۔ اب تو وہ نو سال کا ہونے کو آ رہا تھا۔ گھر میں بھائی بہن سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ سب کا لاڈلا تھا۔ اس کے ابو کا تو وہ کچھ زیادہ ہی لاڈلہ اور پیارا تھا اور اس کے ابو اکثر اس کی خواہشیں پوری کیا کرتے تھے۔ اس کے دونوں بہن بھائی کہتے بھی۔ "ابو! آپ اسید کی ہر ضد پوری کرتے ہیں۔" "وہ ابھی چھوٹا بچہ ہے میرے بڑے بچو! بڑا ہو کر وہ ایک دن تمہارے جیسا سمجھدار بھی ہو جائے گا۔" ابو بڑے بچوں کو سمجھا دیتے۔ "اسید ضدی نہیں ہے۔۔۔ بس تھوڑا نا سمجھ اور شرارتی ہے۔ ذہین ہے اور پڑھنے لکھنے میں بھی ہوشیار ہے۔ روزانہ میرے پاس پڑھنے کے لئے بیٹھتا ہے۔ اسکول اور مدرسے کا سبق بھی یاد کرتا ہے۔" اس کی امی بھی دونوں بڑے بچوں کو سمجھا دیتیں۔

ایک دن اسید کو اپنے ایک دوسرے دوست سے معلوم ہوا کہ اس کی گلی کے ہی ایک گھر میں کوئی نئے کرائے دار آئے ہوئے ہیں۔ جن کے یہاں ایک بلی ہے اور اس کے تین چار اچھے بڑے بڑے بچے بھی ہیں۔ یہ سن کر جیسے وہ تو خوشی کے مارے اچھل پڑا اور امی ابو کی اجازت سے بلی کا ایک بچہ مانگ کر لے آیا۔ نئے کرائے دار نے آنا کانی نہیں کی اور بلی کا ایک بچہ اسے دے دیا۔ جسے پا کر اسید کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ اسے روزانہ ناشتے میں جو دودھ ملتا اس میں سے تھوڑا دودھ بچا کر وہ بلی کے بچے کو پلاتا۔ اسے ملنے والے روپیوں میں سے کبھی چاکلیٹ تو کبھی بسکٹ وغیرہ کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز بلی کے بچے کے لیے لاتا۔ بلی کے بچے کا خاص خیال رکھتا۔ اسے اچھی جگہ سلاتا۔ اسید کو سمجھایا گیا کہ بلی کا بچہ چاکلیٹ یا اس جیسی کوئی اور چیز نہیں کھاتا۔ وہ ابھی چھوٹا ہے وہ صرف دودھ پی سکتا ہے۔

اسید کو بلی کا بچہ گھر لائے دو تین دن ہو چکے تھے، مگر بلی کا وہ بچہ اسید اور گھر کے دیگر افراد سے مانوس نہیں ہو پا رہا تھا اور دودھ بھی ٹھیک سے نہیں پی رہا تھا۔ بس "میاؤں میاؤں" کی آوازیں نکالتا ہوا گھر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حرکتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا، اسید فوراً اسے گود میں اٹھا لیتا۔ اس کے جسم پر بڑی محبت اور

کسی بوڑھے کی طرح شفقت سے ہاتھ پھیرتا۔ دودھ پلانے کی کوشش کرتا۔ اسے کوئی نہ کوئی چیز کھلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ بلی کا وہ بچہ جیسے تیسے دودھ تو پی لیتا مگر پھر ''میاؤں میاؤں'' شروع کر دیتا۔ اس کی اس ''میاؤں میاؤں'' سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ گھر میں اب چوہے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ حالاں کہ فی الحال وہ بچہ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ چوہوں کا شکار کرے لیکن چوہوں کے لیے تو بلی یا اس کے بچے کی ''میاؤں میاؤں'' کی آواز ہی کافی ہوتی ہے۔ گھر میں چھچھوندر بھی کہیں سے آ جاتی تھی مگر اب وہ بھی نہیں آ رہی تھی۔

پھر چوتھے دن تو جیسے اسید کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''امی۔۔۔! یہ بچہ ہمارے گھر میں کیوں نہیں رہ رہا ہے۔ ٹھیک سے دودھ بھی نہیں پی رہا ہے۔ بس ''میاؤں میاؤں'' کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔'' اس نے امی سے بلی کے بچے کی شکایت کی۔ پھر اپنے ابو سے کہا۔ ''ابو۔۔۔! کیوں نہ ہم ایک پنجرہ لا کر اس میں بلی کے بچے کو رکھیں۔ پھر یہ بھاگ بھی نہیں سکے گا۔'' اس کے ابو کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولے۔ ''بیٹا! بلی کے بچے کو کسی پنجرہ میں نہیں رکھا جاتا۔ ہاں! اسے باندھ کر ضرور رکھ سکتے ہیں۔'' ''پھر میرے ایک دوست کے یہاں جو طوطا ہے، وہ تو اسے پنجرے میں رکھتے ہیں؟!'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''بیٹا! وہ پرندہ ہے اسے پنجرے میں ہی رکھا جاتا ہے۔ بلی کا بچہ ایک پالتو جانور تو ہے، لیکن اسے اس طرح قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔'' امی نے کہا۔ ''بلی کے بچے کو ہی کیا، طوطے کو بھی پنجرے میں قید کر کے نہیں رکھنا چاہیے۔'' اس کے ابو نے کہا۔ ''کیوں بھلا؟'' اس نے پھر پوچھا۔ ''ہم تو بلی کے اس بچے کو دودھ پلا رہے ہیں اور اس کا بہت خیال بھی رکھ رہے ہیں۔ کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں ہونے دے رہے ہیں۔'' اسید نے کہا۔ ''بیٹا! سوچ کر بولو۔۔۔! اگر ہم تمہیں ایک کمرے میں قید کر کے رکھیں۔ اچھے سے اچھا کھانا کھلائیں۔ لڈّو، پیڑے، گلاب جامن وغیرہ مٹھائیاں، چاکلیٹ اور ٹافیاں کھانے کے لیے دیں اور پینے کے لیے دودھ، دہی اور شربت دیں۔ پہننے کے لیے نئے نئے عمدہ لباس دیں۔ کھیلنے کے لئے ڈھیر سارے کھلونے دیں، لیکن تمہیں اس کمرے سے باہر نکلنے نہ دیں بلکہ وہیں تمہارے لیے دیگر ضروریات کا بھی انتظام کریں۔ تمہیں امی، ابو اور بھائی بہن سے بھی نہ ملنے دیا جائے۔ تو کیا تم اس طرح ایک کمرے میں قید رہ سکو گے؟'' ابو نے کہا اور اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔

''نہیں تو ابو۔۔۔! اس طرح تو میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ بھلا قید میں رہنا کون پسند کرے گا؟'' وہ بولا۔ ''اسی لیے بیٹا! بلی کا بچہ ہو یا طوطا، انھیں قید کر کے نہیں رکھنا چاہیے۔ اپنی آزادی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور جانوروں یا پرندوں کو قید کر کے رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔'' امی نے کہا۔ ''ہ۔ہو۔و۔ں!'' کہہ کر وہ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ ''بیٹا! بلی کا یہ بچہ اپنی امی کو ڈھونڈ رہا ہے اور اس کی امی بھی اسے تلاش کر رہی ہو گی اور پریشان ہو رہی ہو گی۔'' ابو نے کہا۔ ''اس لیے تم اس بچے کو اس کی امی کے پاس واپس چھوڑ کر آ جاؤ۔'' اس کا بڑا بھائی بولا۔ ''اس طرح تمہیں ایک ماں کی دعا بھی ملے گی۔'' بہن نے کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ''بیٹا! یہ اگست کا مہینہ ہے اور اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہمارا ملک ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔ ورنہ ہم تو غلام اور قیدی تھے۔'' امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! آزادی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کسی کی آزادی نہیں چھیننی چاہیے۔ پھر وہ جانور ہی کیوں نہ ہو۔'' ابو نے بھی اسے سمجھایا۔ تھوڑی دیر کوئی کچھ نہیں بولا۔

پھر اچانک اسید ایک جھٹکے سے اٹھا اور ایک دم سے بلی کے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ جیسے کوئی اس سے بلی کا بچہ چھیننا چاہ رہا ہو۔ پھر وہ بڑے پیار سے بلی کے بچے کو نہارنے لگا اور دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھانے لگا۔ ''کہاں جا رہے ہو اسید؟!'' ابو کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ ''بلی کے اس بچے کو اس کی ماں کے حوالے کرنے جا رہا ہوں اور سوری بھی کہوں گا۔ جاؤں!۔۔۔'' اس نے ابو کی طرف دیکھا۔ ''جاؤں۔۔۔ امی! '' اس بار اس نے اپنی امی کی طرف دیکھ کر پوچھا اور بھائی بہن کی طرف بھی نظریں دوڑائیں۔ اس کی امی مسکرانے لگیں اور ابو نے بھی اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔ بہن بھائی خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ سبھی کا دل بھر آیا تھا۔ اور اسید۔۔۔ وہ تو جیسے آزادی کی امنگ سے بھر گیا تھا۔ اسے بلی کے بچے کے چلے جانے کے دکھ سے زیادہ بلی کے بچے کی آزادی کی خوشی تھی۔ اور بلی کا بچہ پھر ''میاؤں میاؤں'' کرنے لگا تھا، مگر اب اس کی ''میاؤں میاؤں'' میں آزادی کی امنگ جھلک رہی تھی۔

Behind Haqqaniya Masjid, Bardane Wali Gali,
Muzaffar Nagar, Tq. & Distt.Akola-444006 (M.S)
Mobile: 8087382570

ڈرامہ

آزادی کا دیوتا

......سید اسد تابش

کردار

دادی اماں	:	خیر النساء خاتون
ابو	:	کاشف صاحب
امی	:	ریحانہ خاتون
تین بچے	:	تحریم، سفیان اور فرقان

گھر کے ہال میں تینوں بہن بھائیوں، تحریم، سفیان اور فرقان نے میوزک سسٹم میں ''ہر کرم اپنا کریں گے اے وطن تیرے لیے'' گیت اونچی آواز میں لگا رکھا ہے۔ دادی اپنی خواب گاہ (بیڈروم) سے آتی ہیں۔ دادی کے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ بچوں کا شور ان کی یکسوئی میں خلل ڈال رہا ہے۔

دادی: (ترش لہجے میں) کیوں اتنی اونچی آواز میں میوزک چلا رہے ہو۔۔؟

تحریم: دادی اماں، آپ کو پتہ نہیں۔۔۔؟ آج آزادی کا دن ہے۔آج ۱۵ راگست ہے۔

دادی: میرے اللہ! اس لاک ڈاؤن میں تو نہ عید، دیوالی کا پتہ چل رہا ہے نہ یومِ آزادی اور یومِ جمہوریہ کا۔۔

سفیان: اسی لیے دادی اماں، ہم آزادی کا دن گھر میں ہی منا رہے ہیں۔

فرقان: اور آج ہمیں آپ کی طرف سے مٹھائیاں چاہئیں ہر سال اسکول میں آزادی کے دن مٹھائی ملتی ہے نا؟

دادی: ہاں بچو! اس وبا نے ساری دنیا کو قید کرلیا ہے۔ میں تمھیں ضرور مٹھائی دوں گی۔ میں نے پہلے ہی سے گولیاں منگا رکھی ہیں۔

سفیان: دادی اماں! آج کل تو اسکولوں میں بھی چاکلیٹ مل رہے ہیں۔ یہ پرانے زمانے کی گولیاں کون کھاتا ہے؟

دادی: ٹھیک ہے میرے بچو! مگر چاکلیٹ کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ تب تک آزادی کے متعلق کچھ پروگرام کریں۔

تحریم: دادی آپ ہی ہمیں پرانے زمانے کے یومِ آزادی کی باتیں سنائیے۔

دادی: ہاں! میں بھی سناؤں گی، مگر کچھ تم بھی سناؤ۔

تحریم: دادی، دو سال سے تو لاک ڈاؤن ہی ہے اور میں تو صرف دو سال ہی اسکول گئی ہوں۔۔۔ نرسری اور ایل۔کے۔جی۔ اب بھلا ان دو کلاسوں میں مجھے کیا پتہ چلے گا۔

دادی: اچھا میری بچی! تم صحیح کہہ رہی ہو۔ اس لاک ڈاؤن نے سب کچھ بند کر دیا ہے۔

سفیان: یہ وبا پتہ نہیں کب ختم ہوگی۔ ہم تو قید ہو کر رہ گئے ہیں۔

دادی: یہ بھی تم نے خوب کہی۔۔۔ تمھاری اسی بات سے مجھے آزادی سے پہلے کے دن یاد آرہے ہیں۔ فرقان دیکھو، میرا موبائل لے آؤ، میں پہلے تمھارے چاکلیٹ کے لیے شاہد کو فون کرتی ہوں۔ اس کے بعد میں تم سب کو آزادی کی کہانی سناؤں گی۔ (فرقان جلدی جاتا ہے اور دوسرے کمرے سے دادی کا موبائل لے آتا ہے۔ دادی اپنے بیٹے شاہد کو فون لگاتی ہیں۔)

دادی: (موبائل پر) ہاں، وعلیکم السلام میرے بچے۔۔۔ شاہد آج تمھیں پتہ ہے نا، یومِ آزادی ہے۔۔ اور میں نے گھر کے سب بچوں کو چاکلیٹ دینا ہے۔۔ کیا کہا۔۔؟ تم چوک میں ہی ہو۔۔ تو ٹھیک ہے بیٹا، کچھ اچھے سے چاکلیٹ لیتے آنا۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔۔ اللہ حافظ

سفیان: چلیے دادی آپ کہانی شروع کریں۔

دادی: ٹھیک ہے، مگر سفیان سب سے پہلے تم قومی ترانہ گا کر سناؤ۔ (سب بچے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں۔)

سفیان: ہاں دادی! میں سناتا ہوں۔۔ سفیان کھڑے ہو کر

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

ترنم کے ساتھ سناتا ہے۔ (سفیان کے قومی ترانہ ختم کرتے ہی شاہد

صاحب گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں چاکلیٹ کے پیکٹ ہیں اور کچھ دیگر سامان)

تحریم: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) اتنے سارے چاکلیٹ۔۔۔

تبھی امی کمرے میں آتی ہیں اور شاہد کے ہاتھوں سے چاکلیٹ کے پاکٹ اور دیگر چیزیں لیتی ہیں۔دادی بھی اتنے سارے چاکلیٹ دیکھ کر حیران ہوتی ہیں۔شاہد (ریحانہ خاتون کے کانوں میں کچھ کہتا ہے)

ریحانہ خاتون: سنو فرقان، پڑوس سے طلحہ، ابوذر، یحیٰ اور ثمیرہ کو بھی بلا لاؤ۔۔ ہال میں بٹھا کر سب کو چاکلیٹ تقسیم کرو۔

فرقان: نہیں امی! ہمیں دادی سے آزادی کی کہانی بھی سننی ہے۔

ریحانہ خاتون: تو کیا ہوا۔ دادی اماں کی کہانی تمھارے دوست بھی سن لیں گے۔

تحریم: ہاں۔۔ بہت مزہ آئے گا۔فرقان بھیّا اگر آپ نہیں جانا چاہتے ہو تو میں بلا کر لاتی ہوں۔

(تحریم دوڑتے ہوئے جاتی ہے اور پڑوس سے بچوں کو بلا لاتی ہے۔سبھی بچے ہال میں آ کر بیٹھتے ہیں۔)

شاہد صاحب (کمرے سے آتے ہوئے چاکلیٹ لاتے ہیں اور اپنی امی جان کو دیتے ہیں۔)

لو امی، آپ ہی تقسیم کر دو۔۔۔

فرقان: نہیں۔۔نہیں پہلے ہم دادی سے آزادی کی کہانی سنیں گے۔

سفیان: (بے صبری سے) بھیّا آپ کہانی سننے کے بعد چاکلیٹ لینا، ہمیں تو لینے دو۔

شاہد صاحب: ٹھیک ہے بچو! دادی پہلے چاکلیٹ دیں گی اس کے بعد کہانی۔

(سب بچے تالیاں بجاتے ہیں۔)

چاکلیٹ تقسیم کرنے کے بعد دادی گاؤ تکیوں پر ٹیک لگا کر دیوان پر بیٹھتی ہیں اور بولنا شروع کرتی ہیں۔

دادی: بچو! آج سے بہت سال پہلے ہمارے ملک پر غیر ملکی انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارا ملک قدرتی دولت سے مالا مال تھا مگر عوام میں تعلیم کی کمی تھی۔تعلیم اور ٹیکنالوجی کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں غربت تھی، بہت سی باتیں لوگوں کو پتہ نہیں تھیں۔انگریز بہت سی دولت ملک سے لوٹ کر لے جاتے رہے۔جب کوئی مخالفت کرتا تو انگریز اپنے جدید ہتھیاروں سے مخالفین کو پسپا کر دیتے۔

(سفیان درمیان میں بول پڑتا ہے)

سفیان: انگریز ہمارے ہی ملک میں ہمارے ہی لوگوں کو مارتے۔۔۔؟

دادی: ہاں بیٹا! کیوں کہ وہ چالاک اور شاطر تھے۔وہ ہمارے ملک کے لوگوں کو آپس میں لڑاتے، اپنی فوج میں بھارت کے ہی فوجیوں کو نوکری دیتے۔خود شان سے حکومت کرتے۔

تحریم: ایسا کب تک چلتا رہا دادی۔۔؟

دادی: بیٹا تحریم، ایسا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔

فرقان: تو کیا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے ملک کی فوج نے انگریزوں سے جنگ جیت لی۔

دادی: ہاں بیٹا! مگر یہ جنگ بغیر ہتھیاروں کے لڑی گئی تھی۔(سب بچے حیرت سے ''بغیر ہتھیاروں کے''؟)

دادی: ہاں بچو! جب ساری کوششیں ناکام ہوگئیں تو ''آزادی کا دیوتا'' آیا۔ وہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ دنیا بھر کے قانون اس نے پڑھے تھے۔ وہ پیشے سے وکیل تھا۔ اس کا نام تھا، موہن داس کرم چند گاندھی۔۔۔ جسے آپ کیا کہتے ہو؟

(دادی بچوں سے سوال کرتی ہیں۔)

طلحہ: دادی وہ ہمارے پیارے باپو مہاتما گاندھی کہلاتے ہیں۔

دادی: شاباش، ہاں تو وہ آزادی کا دیوتا لوگوں کے درد کو اپنا درد سمجھتا تھا۔ ہمارے ملک کے غریب لوگوں کی ہی طرح اس نے بھی صرف ایک دھوتی پہن لی اور ہاتھ میں لاٹھی لیے مظلوموں کے لیے ستیہ گرہ شروع کر دیا۔

سفیان: دادی! آپ تو گاندھی جی کی کہانی سنا رہی ہو، پھر آپ نے انھیں آزادی کا دیوتا کیوں کہا؟

دادی: سفیان بیٹا! اس لیے کہا، کیوں کہ مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور ان کا

عمل دیوتا جیسا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ کبھی جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ انسانوں میں بھید بھاؤ نہیں کرتے تھے۔ صبر اور استقلال سے اپنی راہ پر چلتے تھے۔ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔

ابوذر: ہاں، یہ سب تو بہت نیکی کی باتیں ہیں، دادی کہانی آگے سنائیے نا۔

دادی: ہاں بچو! تو آزادی کے اس دیوتا نے پورے ملک کے لوگوں کو ایک کردیا۔ ہمارے ملک میں بہت سے مذاہب ہیں۔ بہت سی ذاتیں، زبانیں اور بولیاں ہیں۔ آزادی کے اس دیوتا کے ساتھ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب اہنسا کی لڑائی میں شامل ہوئے۔ یعنی ہمارے وہ رہنما مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو اور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر سب گاندھی جی کے قدم سے قدم ملا کر چلتے۔ آزادی کے اس دیوتا نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ انگریزوں کی لاٹھیاں کھائیں، جیل گئے مگر کبھی بھی ہنسا یعنی لڑائی جھگڑا اور فساد نہیں کیا اور نہ ہی ہونے دیا۔ اہنسا کے ذریعے ہی دشمنوں کو ہرایا۔ آخر ایک دن آیا جب اس دیوتا کا جادو چلا اور ملک آزاد ہوا۔

(بچے حیرت سے کہانی سنتے رہے۔ انھیں بہت تعجب ہوا، آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔)

دادی: (سب کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) بچو! آزادی ملنے کے بعد سے یہی ۱۵/اگست کو پورے ملک میں یومِ آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ دیش پریم اور قومی یکجہتی کے گیت بجتے ہیں۔۔

(فرقان سوال کرتا ہے)

فرقان: دادی! آزادی کے دیوتا نے ایسے ظالموں سے آزادی دلادی۔ آخر اس کورونا اور لاک ڈاؤن کی قید سے کون آزادی دلائے گا؟

دادی: فرقان، میرے بچے، میں تم سب بچوں کا دکھ سمجھتی ہوں۔ دیکھنا آسمان سے ایک پری آئے گی اس کے ہاتھوں میں جادو کی چھڑی ہوگی وہ زمین پر اس چھڑی کو گھمائے گی اور کورونا بھاگ جائے گا۔ تب تک تم سب بچے غور سے سنو۔۔ جب تک پری آئے اور جادو کی چھڑی گھما کر کورونا کو بھگا نہ دے، تم سب اپنے اپنے گھروں میں رہو۔ صاف صفائی کا خیال رکھو۔ ماسک لگاؤ اور نیک اعمال کرتے رہو۔

(سب بچے دادی سے وعدہ کرتے ہیں۔ خوشی خوشی ہال سے اٹھتے ہیں، پردہ گرتا ہے۔)

Barsi Takli, Distt. Akola,
Maharashtra
M-8421427656

"قومی یکجہتی"

......پروفیسر شمیم حنفی

بچو! شمیم حنفی صاحب ہمارے بیچ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے قلم کی خوشبو سے موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ وہ مانتے تھے کہ کہانی لکھنے سے زیادہ سنانے کی چیز ہے اس لیے خاص کر جب بچوں کے لیے لکھا تو اس میں وہی انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہی بات آپ اس پیاری سی نظم میں محسوس کریں گے۔ ویسے جب آپ بڑے ہو جائیں گے تو اس عظیم شخصیت کے کام بے انتہا معلوماتی اور دلچسپ پائیں گے لیکن ابھی کے لیے اس نظم سے لطف اندوز ہوں اور دوسروں کو بھی سنائیں۔

چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک بڑھتی جائے ریل
بڑھتی جائے بڑھتی جائے بڑھتی جائے ریل
سوکھے ریگستانوں میں
ہرے بھرے میدانوں میں
نیچے اونچے رستوں پر

فرفرفرفر فرفر فر
چڑھتی جائے چڑھتی جائے چڑھتی جائے ریل
ہم نے کھائے بور کے لڈو، ہم نے موتی چور کے لڈو
یہ رسگلا یہ سندیس، سب کا اپنا اپنا بھیس
لیکن ایک ہی دیس۔۔۔

دیس ہے اپنا رنگ برنگے پھولوں کی اک بیل۔۔
چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک بڑھتی جائے ریل
ہم بنگالی تم پنجابی، یہ صاحب مدراسی
ہم کشمیری تم بہاری، وہ گجرات نواسی
الگ الگ ہی رنگ الگ الگ ہیں ڈھنگ
لیکن سب کو جانا ہوگا اک دوجے کے سنگ

بھول گئے یہ بات تو اِس نے اُس کو دیا ڈھکیل
چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک بڑھتی جائے ریل
ٹیچر نے اک بات بتائی
ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی
پھر یہ جھگڑا اور لڑائی
یہ غصہ اور ہاتھا پائی

یہ ہے کیسا میل۔۔۔۔
چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک بڑھتی جائے ریل
بابو جی سے ابا جی سے
چاچا جی سے انکل جی سے
آؤ ہم سب مل کر پوچھیں

یہ ہے کیسا کھیل۔۔۔۔۔
چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک بڑھتی جائے ریل

بشکریہ صبا شمیم

بچوں کا ترانہ

ہندو مسلم بعد میں ہیں، پہلے ہم انسان ہیں
ایک آدم اور اک حوا ہی کی سب سنتان ہیں
ایکتا کی ہم علامت، پیار کی پہچان ہیں

ہر دھرم انسانیت اور دوستی کا ہے پیام
بھائی چارا، ایکتا اور شانتی کا ہے پیام
سچ کی بنیادوں پہ اچھی زندگی کا ہے پیام

دیش بھکتی کے نشے میں مست اور سرشار ہیں
دیش پر ہم جان دینے کے لیے تیار ہیں
دیش کے ہم ہی سپاہی اور ہمیں سالار ہیں

سارے جگ میں سب سے اچھا دیش ہندوستان ہے
بچہ بچہ دیش پر قربان ہے، قربان ہے
یہ ہماری آتما ہے، یہ ہماری جان ہے

زندہ باد ہندوستان
زندہ باد ہندوستان

کوثر صدیقی

79, A, Ginnori Main Road,
Bhopal-462001
Mob: 9926404171

پندرہ اگست آیا

ہم لوگوں کی دعا نے
محنت اور ایکتا نے
ہم کو یہ دن دکھایا
پندرہ اگست آیا

کیف و خوشی عطا کی
آزاد زندگی دی
دل نے سکون پایا
پندرہ اگست آیا

مرغ سحر بھی بولا
گھونگھٹ سحر نے کھولا
بلبل نے یہ سنایا
پندرہ اگست آیا

پت جھڑ نے منہ چھپایا
ساون نے راگ گایا
ہر غنچہ مسکرایا
پندرہ اگست آیا

گنگا کو موج آئی
کھیتی بھی لہلہائی
ہر ذرہ جگمگایا
پندرہ اگست آیا

نفرت کی لو بجھا کر
من کا دیا جلا کر
الفت کا گیت گایا
پندرہ اگست آیا

پاشا کھڑے ہو کیا تم
کل کے ہو رہنما تم
ستم ہو وطن کی چھایا
پندرہ اگست آیا

حشمت کمال پاشا

B-119, Nawab Wajid Ali Shah Road, Kolkata-700024
Mob: 6290479899

گیت

(ہندوستانی فوج کو خراج تحسین)

ویر ہیں، ویروں کی دھرتی کے پالے ہیں
ہم بھارت کی عزت کے رکھوالے ہیں

کر گزریں گے جو بھی دل میں ٹھانی ہے
یاد رہے یہ طاقت ہندوستانی ہے
ویر ہیں، ویروں کی دھرتی کے پالے ہیں

یارو ہم سے آٹکرانا کھیل نہیں
انگاروں پر چل کر جانا کھیل نہیں
ویر ہیں، ویروں کی دھرتی کے پالے ہیں

شاد ہیں ہم، آباد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم
موم نہیں، کافور نہیں، فولاد ہیں ہم
ویر ہیں، ویروں کی دھرتی کے پالے ہیں

دیس کی خاطر تن من دھن دے ڈالے ہیں
ویر ہیں، ویروں کی دھرتی کے پالے ہیں

عطاء الرحمٰن طارق

701/3A, Vijaya Co-op. Hsg. Society,
Vaishali Nagar, K.K.Road, Mahalaxmi, Mumbai-400011
Tel: 23013812

'آزادی کا گیت'

ہندو ہوں یا کہ مسلم
وہ سکھ ہوں یا عیسائی
ہیں سب ہی بھائی بھائی
سب کو مِری بدھائی
پندرہ اگست آئی
ہر سو بہار چھائی

اپنے وطن کی خاطر
بچوں تمھیں پتا ہے
کتنے بہادروں نے
اپنا لہو دیا ہے
تب شُبھ گھڑی یہ پائی
پندرہ اگست آئی
ہر سو بہار چھائی

ہم تھے غلام پہلے
گھُٹ گھُٹ کے جی رہے تھے
باپو نے ہم سبھی کو
آزادی یہ دلائی
یہ دھرتی جگمگائی
پندرہ اگست آئی
ہر سو بہار چھائی

کھاؤ قسم کہ اب ہم
مل جل کے ہی رہیں گے
دنیا میں نام اونچا
اس دیش کا کریں گے
ہے اس میں ہی بھلائی
پندرہ اگست آئی
ہر سو بہار چھائی

راشد حسین راہی

Aiman Zai, Jalal Nagar, Near Bhullan Khan ki Chaupal,
Shahjahanpur-242001 (U.P.)
Mob: 7007091002

'آزادی کی کہانی'

رات ہوئی تو بولیں نانی
آؤ بچو! سنو کہانی
دنیا میں اک دیش تھا ایسا
جیسے سونے کی ہو چڑیا
اس میں رہتی تھی شہزادی
نام تھا اس کا ، ہاں، آزادی
بھولی بھالی، پیاری پیاری
سیدھی سادی، سچی نیاری
اک دن اک جادوگر آیا
آ کر اس نے جال بچھایا
انگلستان سے آیا تھا وہ
نئے تماشے لایا تھا وہ
جلد ہی ایسا وقت بھی آیا
دیش پہ اس نے قبضہ جمایا
شہزادی کو قید میں ڈالا
اس پہ لگایا موٹا تالا

کچھ کام اس نے اچھے کیے تھے
لیکن گہرے زخم دیے تھے
ظلم وستم تھے اس کے نرالے
گہرے کالے اس کے اجالے
لوگوں نے آواز اٹھائی
لاٹھی کھائی، گولی کھائی
پہلی کوشش بھولے پن میں
اٹھارہ سو ستاون میں
کتنے مولوی، کتنے ویدی
سب نے مل کر جان تھی دیدی
سب کے لیڈر کوئی اگر تھے
تو وہ بہادرشاہ ظفر تھے
کچھ تو اپنوں کی تھی سازش
پھل نہ لائی کوئی کوشش

جدوجہد یہ چلتی رہی پھر
شمع محبت جلتی رہی پھر
بیگم حضرت محل، ادھم سنگھ
اشفاق اللہ اور بھگت سنگھ
ابوالکلام آزاد اٹھے تھے
کر کے خدا کو یاد اٹھے تھے
جیسے کوئی آندھی اٹھے
حکیم اجمل، نہرو آئے
جادوگر کے ذہن پہ چھائے

ہندو مسلم سکھ عیسائی
سب نے پھر تحریک چلائی
مل جل کر آواز اٹھائی
جادوگر نے منہ کی کھائی
سب نے مل کر زور لگایا
جادوگر پھر ٹھہر نہ پایا
شہزادی کو رہا کیا پھر
آزادی کو رہا کیا پھر
بوریا بستر اپنا سمیٹا
پھیلا کاروبار لپیٹا
جہاں سے آیا تھا جادوگر
الٹے پاؤں لوٹا وہیں پر

دیش کا ایسے نام ہے بھارت
کوشش کا انعام ہے بھارت

خود کی ہر پہچان سے پیاری
آزادی ہے جان سے پیاری

خان حسنین عاقبؔ
G. N. Azad College, Posad,
Maharashtra

جشنِ آزادی

ملا ہے یومِ آزادی، تو گائیں
عطا یوں جشن آزادی منائیں

چمن جیسا وطن ہم سب سجائیں
چمن میں پھول خوشبو کے کھلائیں
عطا یوں جشن آزادی منائیں

یہ ثمرہ ہے بڑی قربانیوں کا
کبھی ہرگز نہ یہ باتیں بھلائیں
عطا یوں جشن آزادی منائیں

بلا شک ہم پہ فیضِ بزرگاں ہے
بہر سو فیض کا دریا بہائیں
عطایوں جشن آزادی منائیں

اس میں ہے سبھی کی کامرانی
فرائض ہم سبھی اپنے نبھائیں
عطا یوں جشن آزادی منائیں

عطاعابدی
Marfat Book Emporium, Urdu Bazar,
Sabzi Bagh, Patna-800004
Mob: 7903021559

’’جھنڈا‘‘

نگری ، نگری کہتے ڈولو
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
دیش کی رکشا کرنا سیکھو
حق کی خاطر لڑنا سیکھو
اس کی خاطر مرنا سیکھو

نگری نگری کہتے ڈولو
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
بھارت میں ہیں سب ہی مذہب
ہندو مسلم بھائی ہوں جب
آپس میں نفرت کیا مطلب؟

نگری نگری کہتے ڈولو
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

راحت مظاہری
3/18, Street No.8, Guruduwara Mohalla
Maujpur, Delhi-110053
Mob: 9891562005

آزادی

اب انوکھی دکھائیں آزادی
دوستو یوں منائیں آزادی

گنگا جمنی مزاج ہو اپنا — دل پہ دنیا کے راج ہو اپنا
ہم نے دیکھا تھا سپنا تاریخی — بھائی چارا ہو اپنا تاریخی
اپنے پرکھوں کا نام روشن ہو — ہر گھڑی، صبح و شام روشن ہو
خوب تعبیر اپنے خواب کی ہو — گونج اب سبز انقلاب کی ہو
سونا اگلے زمین پھر اپنی — چمکے زہرہ جبین پھر اپنی
اب نہ ہو رنج کے اسیر، غریب — ایک ہی صف میں ہوں امیر غریب
حوصلے ہوں ہمالیہ سے بلند — ہوں سنہرے اصولوں کے پابند
ہیں جو چھوٹے بڑے، سبھی ہوں شاد — ہم کو گاندھی کا یہ سبق ہو یاد
ہم میں آزاد ہوں جواہر ہوں — شہر میں، گاؤں میں ہوں، گھر گھر ہوں
ہم نہ سچائی کے ڈگر چھوڑیں — نیک کردار کا اثر چھوڑیں
دل وشال اب ہوں ہندسا گر سے — چھلکے امرت وفا کا گاگر سے
اپنا کردار تاج سے ہو حسین — اپنا کل اپنے آج سے ہو حسین
رکھیں ہر پل خیال صدیوں کا — اپنا سچ ہو جمال صدیوں کا

اب انوکھی دکھائیں آزادی
دوستو یوں منائیں آزادی

متین اچل پوری
Akbari Chowk, Biyabani, Achalpur, Amravati, M.S-444806
Mob: 9503199586

پیارا بھارت

پیارا بھارت، پیارا بھارت
آنکھوں کا ہے تارا بھارت
یک جہتی کا چمن ہے بھارت
پیارا سب کا وطن ہے بھارت
کثرت میں ہے اس کی وحدت
ہے جُدا اس کی شان و شوکت
ہندو، مسلم اور عیسائی
رہتے جیسے بھائی بھائی
سب کے سب بھارت کے واسی
چاہتے غیروں سے آزادی
بازی سب نے جاں کی لگادی
تب جاکر ملی آزادی
خوں میں سب کے بہتا بھارت
دل میں سب کے رہتا بھارت
بھارت سے ہے ہم کو رغبت
بھارت سے ہے ہم کو اُلفت
جگ میں شہرت پائے بھارت
آگے بڑھتا جائے بھارت

تبسم اشفاق شیخ
Mumbai, Veerar
Mob: 9561419338

آزادی سے جڑی ایک تصویر پہیلی

همارا صفحہ

★ پندرہ اگست مجھے اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس دن ہندوستان آزاد ہوا تھا۔ پہلے میں بہت پتنگ اُڑاتا تھا پھر ایک دن ہمارے آرٹ کے ٹیچر راجیش سر نے بتایا کہ پتنگ صرف پتنگ نہیں کاٹتی اُس سے چڑیاں تک کٹ کر مرجاتی ہیں یہاں تک کہ اسکوٹر چلانے والوں کے سڑک حادثے تک ہوجاتے ہیں۔ پھر اسی ٹاپک پر پوری کلاس نے تصویریں بنائیں۔ میں اس پندرہ اگست کو ٹی وی پر دیکھوں گا، پتنگ نہیں اُڑاؤں گا۔ ممی سے حلوہ بنوالوں گا پھر حلوہ کھاتے کھاتے ڈرائنگ بناؤں گا۔

منموہن: آٹھویں کلاس، ایس بی جی، تغلق آباد گاؤں، نئی دہلی

★ کورونا کی وجہ سے ہم اسکول نہیں جاکر گھر سے ہی پڑھائی کرتے ہیں۔ ہمارے اسکول میں پندرہ اگست کو جھنڈا پھہرایا جاتا تھا مگر اب سب آن لائن ہو رہا ہے تاکہ ہم محفوظ رہیں میں نماز میں بھی یہی دعا کرتی ہوں۔ میں پندرہ اگست کو اپنی اسکول کی سہیلیوں سے وڈیو کال پر بات کروں گی اور ہم ایک دوسرے کو نظمیں کہانیاں سنائیں گے اور پندرہ اگست منائیں گے۔

عفیفہ رحمٰن، چھٹی کلاس، سن رائز پبلک اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی

★ ممی نے ایک بار پندرہ اگست کو جھنڈے والے چاول بنائے تھے اس بار بھی میں ضِد کر کے اُن سے وہی چاول بنوا رہا ہوں۔ یہ نارنجی سفید ہرے میٹھے چاول میں جب اسکول جاؤں گا تو اپنے دوستوں اور شاید میڈم کو بھی کھلاؤں گا۔ بھائی نے کہا ہے کہ وہ مجھے آزادی کے اوپر بنی ہوئی فلم بھی دکھائیں گے، میں چاہتا ہوں وہ کارٹون فلم ہو۔

ہارِدک گرگ، ۲۵۶، یو جی ایف، نیتی کھنڈ-۲، اندرا پورم، غازی آباد

★ پندرہ اگست مجھے اس لیے بھی اچھا لگتا ہے کیوں کہ اُس دن چھٹی ہوتی ہے مگر چھٹی زیادہ بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جب کورونا کی بیماری ختم ہوجائے گی تو میں اسکول جاکر خوب کھیلوں گا اور وہاں پڑھوں گا بھی ویسے میں بہت تیز بھاگتا ہوں اور اپنے دوستوں میں سب سے تیز بھاگتا ہوں۔ پندرہ اگست کو میں ایک دم آزاد ہوکر بہت تیز بھاگنا چاہتا ہوں۔

تنشک پال، سی ۲۰۲، شکھر انکلیو، سیکٹر-۱۵، وسندرا-۲۰۱۰۱۲

★ جمال ماموں نے کہا ہے کہ وہ مجھے گھر بیٹھے بیٹھے پندرہ اگست کے دن دہلی گھمائیں گے تو ایک تو میں دہلی گھوموں گا اور ہاں ہم ایک پودا بھی لگائیں گے۔ پودوں سے ہمیں آکسیجن ملتی ہے اور اُن میں پھول آنے پر وہ اور اچھے لگتے ہیں۔

حمام سعید، ۱۲۶، شاہین باغ، نئی دہلی

★ میرا نام وردا سائرہ ہے۔ میں سات سال کی ہوں۔ میں تیسری کلاس میں پڑھتی ہوں۔ میرا اسکول ہے ڈی اے وی پبلک اسکول، جسولہ وہار۔ آج میں آپ کو بتاؤں گی کہ میں پندرہ اگست کیسے مناتی ہوں۔ اس بار ہم اپنی بالکونی میں جھنڈا لگائیں گے اور زیادہ باہر نہیں جائیں گے۔ اس سے کورونا وائرس ہم کو لگ سکتا ہے۔ جے ہند

★ میرا نام فاطمہ زہرہ ہے۔ میں دس سال کی ہوں۔ میں چھٹی کلاس میں ہوں اور میں ڈی اے وی پبلک اسکول میں پڑھتی ہوں۔ آج میں آپ سب کو بتاؤں گی کہ میں یومِ آزادی کیسے مناؤں گی۔ میں یومِ آزادی پر باہر نہیں جاؤں گی اور ایک آئس کریم لاؤں گی اور اپنی بالکونی میں جھنڈا لگاؤں گی اور پتنگ بھی نہیں اُڑاؤں گی کیوں کہ پتنگ کے مانجھے سے بہت سی چڑیوں کی جان جاتی ہے۔ میں آپ سب کو یومِ آزادی کی مبارک باد دیتی ہوں۔

★ بچوں کا ماہنامہ امنگ کا تازہ شمارہ مئی، جون، جولائی ۲۰۲۱ نظر نواز ہوا۔ جب سے امنگ نے اپنی تصویر بدلی ہے، اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی، بھانجے، بھتیجے، بھانجیاں اور بھتیجیاں پہلے اس کے کم دیوانے نہیں تھے، اب تو ان لوگوں نے مجھے رسالہ پڑھنا مزید دوبھر کر دیا ہے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر نریش نے بڑے اچھے انداز میں حضرت شیخ فرید گنج شکر کا تعارف کرایا ہے۔ بچوں نے یہ مضمون مجھ سے سنا اور میں نے جب انھیں حضرت شیخ کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

عظیم اقبال کا ''محفوظ شدہ کھانے''، شاہ تاج خان کا ''مچھر۔صرف ایک مچھر''، محمد طاہر صدیقی کا ''فخر ہند: چند شخصیتیں'' اور فرحان بیگ کا ''دہلی میں قطب مینار'' مضامین پسند آئے۔

کہانیوں میں ڈاکٹر بانو سرتاج کا یک بابی ڈرامہ ''صفر کی قیمت''، محمد سراج عظیم کی کہانی ''یادگار عید'' اور ڈاکٹر عادل حیات کی کہانی ''مائی اماں'' بہت اچھی لگیں۔

علیم صبا زیدی کی نظم ہندوستان ہمارا نے دل جیت لیا، خاص طور پر نظم کا یہ بند بہت اچھا لگا۔

اسی کی وفا کے آگے دشمن بھی جھک گیا ہے
اسی سے نظر ملا کے طوفاں بھی رک گیا ہے
کیا خاک مٹ سکے گا ہندوستان ہمارا

ہندوستاں ہمارا

مستقل کالم میں ادبی دماغی ورزش، اب ہنسنے کی باری ہے اور معلومات کی کسوٹی جہاں ہنساتے ہیں، وہیں معلومات کا خزانہ بھی ہیں۔

تمام قلم کاروں کو میری جانب سے مبارک باد

شبنم پروین، ریسرچ اسکالر، جے این یو، نئی دہلی

★ بچوں کا ماہنامہ امنگ کا مئی، جون، جولائی کا مشترکہ شمارہ ملا۔ لیکن یہ کیا صفحات اتنے ہی۔ جب تین ماہ کا شمارہ ہے تو اگر کچھ صفحات میں بھی اضافہ ہوتا تو مزہ آ جاتا۔

ہمیشہ کی طرح امنگ کے مضامین جہاں معلومات میں اضافہ کے سبب بنے وہیں بہت سی نئی باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ جب امتیاز احمد انصاری نے دنیا کے خطرناک مقامات سے واقف کرایا۔ اور محمد طاہر صدیقی نے ہندوستان کی چند مایہ ناز شخصیات سے متعارف کرایا، سید پرویز قیصر کو کیا ہو گیا ہے کیا یہ صرف کرکٹ کو ہی جانتے ہیں، دنیا میں کیا خود ہمارے ملک میں بھی بہت سے کھیل ہیں، بلکہ ہاکی اور کشتی تو عالمی سطح پر ہندوستان کی شناخت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ صرف کرکٹ کے بارے میں ہی بتاتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ بہت بورنگ ہو گیا ہے، ان سے گزارش ہے کہ دوسرے کھیلوں سے بھی امنگ کے قارئین کو واقف کرائیں۔

سید واجد علی شاہ جیلانی کی کارٹون کی کہانی پسند آئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے اچھے انداز میں کہانی سنا جاتے ہیں۔ ایسی خوبیاں بہت کم کہانی کاروں میں پائی جاتی ہیں۔ میری اور میری پوری ٹیم کی جانب سے انھیں بہت بہت مبارک باد۔

نظموں میں محسن باعشن حسرت کی ''کہانی سناؤنا'' اور رخشاں ہاشمی کی ''نئی دوا'' پسند آئی، دونوں شاعروں کو مبارک باد۔ انصاری البینہ نے ''بوجھو تو جانیں'' کے تحت خوب پہیلیاں بجھائی ہیں۔ مزہ آ گیا۔

تمام قلم کاروں کو مبارک باد۔

ماریہ ہارون، نئی دہلی

(نوٹ: تکنیکی مسائل کے سبب صفحات میں اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ادارہ)

SBV Tughlakabad
Village, New Delhi
کے اسکولی بچوں کی
چند تصویریں۔
آپ کی پتنگ
صرف پتنگ
نہیں کاٹتی
ارفعہ عمران،
تیسری کلاس،
دی ٹاؤن اسکول، مالیرکوٹلہ، پنجاب
Angel
SAVE
BIRDS
SAY NO TO
KITES THIS
YEAR

Registered with the Registrar of News Papers for India Under
Bachchon Ka Mahnama Umang
Vol. No. 35, Issue No. 08 August 2021, Pages (68), weight: 230gm.
and sources of News Items (Individual) Price Rs. 8.00
Posting Office of V.P. Pkt. Regd. Pkt. at G.P.O Delhi-110006 &
Posting Single Newspaper RMS Delhi-110006

R.N. No. 47217/87
Regd. No. DL (DG-11) 8020 /2021-23
ISSN No. 2321-287X
Date of Posting: 1st & 2nd August 2021
Date of Publishing / Printing: 31-07-2021

وطن کا راگ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رُت ہر اک موسم اُس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سہانا کیسا سندر پیارا دیش ہمارا ہے
دُکھ میں سُکھ میں، ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے
پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکشا کرتا ہے، بھارت کا رکھوالا ہے
لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں، لاکھوں ندیوں والا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سناتی جاتی ہیں
صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں
کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

افسر میرٹھی

حامد اللہ افسر میرٹھی ۲۶ نومبر ۱۸۹۵ کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ عہد مغلیہ میں ان کے بزرگوں کو میرٹھ میں چند گاؤں عطا کیے گئے تھے۔ ان کا خاندان مفتیوں کا معروف خاندان کہلاتا تھا۔ ان کے والد کا نام مفتی محمد عصمت اللہ تھا۔ وہ مقامی سرکاری اسکول میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ افسر اپنے والد کی سرپرستی میں بچپن سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔

افسر میرٹھی نے اردو زبان وادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن وہ بچوں کے ادب کے لیے زیادہ مشہور ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے ''ڈالی کا جوگ'' اور ''آنکھ کا نور'' شائع ہوئے۔

بچوں کی درسیات کے لیے ان کی تصانیف میں ''آسمان کا ہمسایہ'' ''امکانوں کی کہانی''، ''حکایات گاندھی''، ''جانوروں کی عقل مندی''، ''پندرہ اگست''، ''لوہے کی چیل''، ''ترقی کی راہیں''، ''ہمارا جھنڈا'' وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔

۱۹/اپریل ۱۹۴۷ کو ان کا انتقال ہوا اور اگلے روز قدیم اطبا کے خاندانی قبرستان لکھنؤ میں آسودہ خاک ہوئے۔

Printed & Published by Editor Mohammed A Abid, Secretary Urdu Academy, on behalf of Urdu Academy, Delhi (Govt. of Delhi)
Printed at SDM Printer & Packer, B-215, Sector-4, G.F., Bawana, Indl. Area, Delhi-110039
and published from Urdu Academy, Delhi, C.P.O. Building, Near Ritz Cinema, Kashmere Gate, Delhi-110006